ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company
ڈاکٹر گوہر نوشاہی
بحیثیت محقق
محمد افضل صفی
الفتح
پبلی کیشنز

ڈاکٹر گوہر نوشاہی بحیثیت محقق

محمد افضل صفی

الفتح پبلی کیشنز

راولپنڈی

اشاعت اوّل ۲۰۱۰ء

۱۷۰.۹۲
ص ف ی   صفی، محمد افضل
ڈاکٹر گوہر نوشاہی بحیثیت محقق/محمد افضل صفی۔
راولپنڈی: الفتح پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء
۲۲۰ ص
۱. گوہر نوشاہی، ڈاکٹر   ۲. محمد افضل صفی
۳. تصاویر

170.92
SAF Safee, Muhammad Afzal
Dr. Gohar Naushahi ba'haiseiyat Mohaqqiq/ by Muhammad Afzal Safee.- Rawalpindi: Al-Fath Publications, 2010
220 p.
ISBN 978-969-9400-11-7

الفتح پبلی کیشنز
- + 92 322 517 741 3
- alfathpublications@gmail.com

distributor

VPrint Book Productions

- + 92 51 581 479 6
- + 92 300 519 254 3
- vprint.vp@gmail.com
- www.vprint.com.pk

392-A, St. 5-A, Lane 5, Gulraiz Housing Scheme-2, Rawalpindi

فہرست

ابتدائیہ

علمی و تحقیقی حوالے سے میری پہلی کاوش ڈاکٹر گوہر نوشاہی بحیثیت محقق آپ کے سامنے ہے۔ اس سے قبل میرے دو شعری مجموعے صحراسے گفتگو اور نگاہیں اداس ہیں منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ موجودہ کتاب میرے اس مقالے پر مشتمل ہے جو میں نے زیرِ نظر عنوان کے تحت علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے لیے لکھا تھا، اور جس پر مجھے ایم فل اُردو کی ڈگری تفویض کی جا چکی ہے۔

میرا یہ کام تحقیقی اعتبار سے کس درجے کا ہے، اس کا فیصلہ علم و تحقیق سے شغف رکھنے والے قارئین ہی کریں گے۔ میں تو صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ اپنے مطالعے کی تنگ دامانی اور وقت کی حدود و قیود کے باوجود میں نے کوشش کی ہے کہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، جنھیں برصغیر پاک و ہند میں عالمی سطح پر اہلِ تحقیق ایک جانی مانی شخصیت سمجھتے ہیں، اُن پر سنجیدگی، متانت اور خلوص سے کام کر سکوں۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے علمی اور تحقیقی کارنامے مختلف موضوعات اور ایک سے زیادہ زبانوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بالخصوص اُردو، فارسی اور پنجابی زبانوں میں اُن کا کام قابلِ قدر ہے۔ ہمارے عہد کے ہر بڑے محقق نے، خواہ اس کا تعلق پاکستان سے ہو، ایران سے ہو یا بھارت سے، ڈاکٹر صاحب کے معیارِ تحقیق کو تسلیم کیا ہے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں اہلِ دانش کے تصورات کو اُجاگر کرنے کی بساط بھر سعی کی ہے۔

اس تحقیقی اور علمی سفر میں مجھے جن بزرگوں کی سرپرستی اور اعانت نصیب ہوئی، اُن میں ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر، ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کا شکریہ بالخصوص مجھ پر واجب ہے۔

کرم فرماؤں اور دوستوں میں سے جناب افتخار عارف، ڈاکٹر عطش درّانی، ڈاکٹر عبدالغفور

شاہ قاسم، بیرسٹر صابر کیفی، ڈاکٹر شفیق انجم، ڈاکٹر طارق محمود، خالد محمود، ریاض راہی، حفیظ اللہ بیگ اور ذیشان رند کا ممنون ہوں، جنھوں نے مجھے اپنی آرا اور موضوع کے بارے میں گرانقدر مواد عطا فرمایا۔ آخر میں اپنے والد محترم، بہن، بھائیوں اور خصوصاً اپنی اہلیہ شمائلہ نوشین کا تہِ دل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے گھر میں مجھے ایسا ماحول فراہم کیا جس سے میں اپنے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکا ہوں۔

محمد افضل صفی
یکم جون ۲۰۰۹ء
اُستادِ شعبۂ اُردو
گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج،
مظفر گڑھ

حرفے چند

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا شمار عہدِ موجود کے ممتاز محققین، مدوّنین اور دانش وروں میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق لاہور کے دبستانِ تحقیق سے ہے۔ انھوں نے ایسے اساتذہ سے تحقیق کے اسرار و رموز سیکھے جو حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع اور شیخ محمد اقبال جیسے اساتذہ کے علم و فضل کے وارث اور اُن کے اُسلوبِ تحقیق کے متبعین میں بہت بلند درجہ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اپنی علمی خدمات، تدوینی اور تحقیقی کارناموں سے لاہور کے دبستانِ تحقیق کی روایت کو نہ صرف قائم رکھا، بلکہ اس کی ثروت میں گرانقدر اضافہ بھی کیا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے علمی زندگی کا آغاز استاد کی حیثیت سے کیا، لیکن بہت جلد وہ مجلسِ ترقیِ ادب سے بہ طور مدیرِ تالیفات وابستہ ہو گئے۔ اس ادارے میں انھیں امتیاز علی تاج، سیّد عابد علی عابد اور کلب علی خاں فائق جیسے اکابر کے ساتھ کام کرنے کی سعادت ملی اور صحیح معنوں میں ان کی تحقیقی صلاحیتوں کو یہاں پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ لاہور میں انھیں ڈاکٹر سیّد عبداللہ، سجاد باقر رضوی، حمید احمد خاں، خلیل الرحمٰن داؤدی اور ڈاکٹر وحید قریشی جیسے علمائے ادب سے کسبِ فیض کرنے اور ان کی علمی مجالس میں بیٹھنے کی سہولت بھی حاصل تھی، سو بہت کم عرصے میں انھوں نے محنت، ریاضت اور شوق کے باعث ایسے تحقیقی اور تدوینی کارنامے انجام دیے، جن کے باعث ان کا شمار اہم محققین میں ہونے لگا۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اگرچہ مختلف موضوعات پر دادِ تحقیق دی ہے، تاہم ان کی تحقیقات کا غالب حصہ پنجاب اور اُردو کے تعلق سے جُڑا ہوا ہے۔ انھوں نے اُردو تحقیق کے معلّمِ اوّل حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر وحید قریشی، قاضی فضلِ حق اور پیر غلام دستگیر نامی کے کام کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ لاہور کے چشتی خاندان کی اُردو خدمات، یادگارِ چشتی (مولوی نور احمد چشتی)، مثنوی رمز العشق مع چرخی نامہ (غلام قادر شاہ)، لاہور میں اُردو شاعری کی روایت اور بیسیوں

مقالات کے ذریعے پنجاب اور اُردو کے تعلق خاطر کو ڈاکٹر صاحب نے نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کی تحقیقی کاوشوں سے اُردو ادب کے کئی گوشے پہلی بار سامنے آئے۔ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی علمی، تحقیقی اور تدوینی خدمات کا اعتراف تمام اکابرینِ ادب نے کیا ہے، جو مضامین، تبصروں اور مکاتیب کی صورت میں موجود ہے۔ڈاکٹر شفیق انجم نے ان کا انتخاب **ڈاکٹر گوہر نوشاہی: ایک مطالعہ** کی صورت میں پیش کیا ہے، تاہم ضرورت اس امر کی تھی کہ ان کی تحقیقی اور تدوینی خدمات اور کارناموں کا مفصل جائزہ لیا جائے۔محمد افضل صفی نے ایم.فل (اُردو) کی تکمیل کے لیے ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی تحقیقی خدمات کو موضوع بنا کر اِس ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔محمد افضل صفی صاحب کی یہ کوشش لائقِ تحسین اور قابلِ داد ہے۔انھوں نے محنت، جستجو اور شوق کے بل پر یہ منزل سر کی ہے۔گوہر شناسی میں اس مقالے کی حیثیت سنگِ میل کی سی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ گوہر صاحب کے حوالے سے آئندہ کام کرنے والوں کے لیے یہ مقالہ مشعلِ راہ کا کام دے گا۔

زیرِ نظر مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب اُردو میں تحقیق کی روایت اور دبستانِ لاہور کی تشکیل کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔اس باب میں فاضل مقالہ نگار نے نہایت اجمال کے ساتھ اُردو میں تحقیق کی روایت، دبستانِ لاہور کی تشکیل، اہم محققین کے اُسلوب و انداز اور لاہور کے دبستانِ تحقیق کے امتیازات اور اختصاصات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ فاضل مقالہ نگار کی اس رائے سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان بھر کے ممتاز محققین دبستانِ لاہور کے خوشہ چین رہے ہیں اور ان کی تحقیقی کارگزاری میں اس دبستان کا رنگ واضح طور پر جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

دوسرا باب ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی سیرت اور ان کی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔مقالہ نگار نے مستند مآخذ و مصادر کی مدد سے ڈاکٹر صاحب کے خاندانی پس منظر، اُن کی علمی و روحانی خدمات اور ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی تعلیم و تربیت کے مختلف مراحل و مدارج اور اُن کی زندگی کے ستر سالہ سفر کو نہایت اختصار، مگر جامعیت کے ساتھ مرتب کیا ہے۔مقالہ نگار نے ڈاکٹر گوہر کے اساتذہ، اعزہ، تلامذہ اور دوستوں کے بیانات اور آرا سے ان کی شخصیت کی ہمہ رنگی کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

تیسرے اور چوتھے ابواب میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی تحقیقی اور تدوینی خدمات کا تفصیل کے

ساتھ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی جملہ تصانیف اور ان کی تدوینات کا الگ الگ تجزیہ کیا گیا ہے اور ان کے مندرجات کے حوالے سے ان کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے محض اہلِ علم کے اقتباسات پیش نہیں کیے، بلکہ جا بہ جا اپنا ذاتی تاثر بھی پیش کیا ہے۔ ان کے ذاتی تاثر میں کہیں کہیں اختلاف کا پہلو بھی دکھائی دیتا ہے جو مقالے کو "مدلّل مداحی" کے اعتراض سے بچاتا ہے۔

پانچویں باب میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی فارسی خدمات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا تعلق ایک علمی اور روحانی خاندان سے ہے، اس لیے انھیں بچپن ہی سے عربی اور فارسی پڑھنے اور سیکھنے کا موقع ملا۔ فارسی سے ڈاکٹر صاحب کی وابستگی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ابتدائی عمر میں مبتدیوں کے لیے فارسی کا ایک قاعدہ لکھا۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب کئی سال مشہد یونیورسٹی، ایران سے بہ طور ریسرچ سکالر اور استادِ ادبیاتِ اُردو و پاکستان شناسی وابستہ رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اگرچہ فارسی میں زیادہ کام نہیں کیا، تاہم ان کے جو مقالات ایران اور پاکستان کے فارسی جرائد میں شائع ہوئے اُن کی قدر و قیمت سے انکار ممکن نہیں۔ محمد افضل صفی نے ڈاکٹر صاحب کی فارسی خدمات کی تفصیل بھی فراہم کی ہے اور ان کے مندرجات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

محمد افضل صفی نے نہایت محنت اور عرق ریزی سے ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی زندگی اور اُن کے تحقیقی و تدوینی کارناموں کا جائزہ پیش کیا ہے۔ نتائج کے استخراج اور کتابوں کے تجزیے میں انھوں نے تحقیقی اور تنقیدی اُصولوں اور قاعدوں کی مکمل پاسداری کی ہے۔ ان کا اُسلوبِ نگارش سادہ مگر دلکش اور رواں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اربابِ علم اور اصحابِ تحقیق محمد افضل صفی کی اس محنت اور کاوش کو شرفِ پذیرائی بخشیں گے۔ ان شاء اللہ!

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

۲۲ر جون ۲۰۱۰ء

استادِ شعبۂ اُردو،

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

تاثرات

ڈاکٹر گوہر نوشاہی اُردو تحقیق کا ایک معتبر نام ہے۔ اُردو تحقیق کا یہ مردِ درویش اسلام آباد جیسے غیر تحقیقی شہر میں تحقیق کا چراغ جلائے ہوئے بیٹھا ہے اور اپنی علمی فضیلت کے سبب اس شہر کی علمی آبرو کا محافظ سمجھا جاتا ہے۔ گوہر کی تحقیقی زندگی کئی دہائیوں پر محیط ہے۔ اس کے ادبی سفر کا آغاز بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور سے ہوا تھا، جہاں اُس دَور میں اس نے تحقیق و تدوین کے شاندار کارنامے انجام دیے تھے۔ گوہر نوشاہی فطرتاً محقق آدمی ہے اسی لیے اس کے تمام تحقیقی کاموں میں اس محقق آدمی کی گہری چھاپ ملتی ہے۔ تحقیق کے ہنر میں وہ دستاویزی تحقیق سے متاثر ہے اور یہ عطیہ ہے لاہور کے دبستانِ تحقیق کا، کہ جس کا وہ پیرو ہے۔ تحقیق اور تدوین کی دنیا میں دستاویزی تحقیق کو اس نے کمال خوبی سے استعمال کیا ہے۔ اس وقت پاکستانی دانش گاہوں میں تحقیق اور اُصولِ تحقیق کی باتیں تو بہت کی جاتی ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہماری نئی نسل تحقیق کے کلاسیکی طریق سے دور بھاگ گئی ہے۔ اس لیے مستقبل میں اس نوعیت کا کام کم کم ہی ہوتا نظر آتا ہے۔ اس قسم کے علمی ماحول میں گوہر جیسے محققین کا وجود بہت غنیمت ہے۔ محمد افضل صفی نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے لیے گوہر نوشاہی کی تحقیق پر ایم فل کا تحقیقی مقالہ تحریر کیا تھا۔ محمد افضل صفی نے گوہر کی تحقیق و تدوین کی بہتر تفہیم کے لیے ایک قابلِ قدر کام کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مقالہ گوہر شناسی کے میدان میں ایک قابلِ تحسین سعی قرار دیا جائے گا۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری

✦

تحقیق ایک کارِ آساں نہیں، یہ بڑی دشوار گزار راہ ہے جس پر ہر ایک کا چلنا اور کامیابی سے گزرنا ممکن نہیں۔ سب سے پہلے تو اس کے لیے ایک اعلیٰ، پختہ اور شائستہ ذوق کی ضرورت ہے اور پھر مطالعے کی وسعت، تنوع اور گہرائی بھی ناگزیر ہے۔ جب یہ سب خصوصیات کسی ایک میں یکجا ہوں تو وہ محقق اعلیٰ درجے کے تحقیقی کارنامے انجام دے سکتا ہے یا تحقیق کا حق ادا کر سکتا ہے۔ بظاہر تنقید لکھنے، سرسری تاریخی جائزہ مرتب کرنے کو بھی لوگ بزعمِ خویش تحقیق قرار دیتے اور اپنے آپ کے محقق ہونے کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں۔

عہدِ حاضر میں تحقیق اپنے حقیقی معنوں میں جن افراد کے ساتھ مخصوص اور بامعنی نظر آتی ہے اُن کی تعداد محض انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی ان معدودے چند محققین میں سے ہیں جو تحقیق کا ذوق اور مزاج رکھتے ہیں اور اس کے حسن و سلیقے اور شائستہ و پختہ اُسلوب کے ساتھ تحقیق کا حق ادا کرتے رہے ہیں۔ ان کا مطالعہ بے حد وسیع اور وقیع ہے اور کلاسیکی ادب کو جیسے انھوں نے کھنگال رکھا ہے۔ بیک وقت تحقیقی مطالعات اور ترتیب و تدوین اور روایت و تاریخ سب ہی ان کی دلچسپی اور کاوشوں کے میدان ہیں، جن میں ان کے کیے ہوئے متعدد کام تاریخِ تحقیق میں بھلائے نہ جا سکیں گے۔ اُردو تحقیق کے دبستانِ لاہور کے ایک محقق کی حیثیت میں اور خود دبستانِ لاہور کی تحقیق میں ان کا مقام نمایاں ہے اور نمایاں رہے گا۔

محمد افضل صفی کی یہ کاوش ایک پختہ کار محقق کو مزید متعارف کرانے کی ایک مخلصانہ، عقیدت مندانہ اور سنجیدہ کوشش ہے، اور اپنے موضوع کا حق ادا کرتی ہے۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل

✦

ڈاکٹر گوہر نوشاہی ایک ممتاز محقق و نقاد ہیں۔ اُن کا تعلق تحقیق کے دبستانِ لاہور سے ہے، جہاں خارجی و داخلی دونوں طرح کی شہادتوں کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ گوہر نوشاہی کی خوبی یہ ہے کہ اُن کی زبان بہت سلیس اور رواں دواں ہے، جس کی وجہ سے اُن کی تحریر کی معنوی وسعت قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اُن کے تحقیقی موضوعات میں پھیلاؤ اور انفرادیت ہے۔ پاکستانی اُردو تحقیق میں اُن کا نام اہمیت اور انفرادیت کا حامل ہے۔

محمد افضل صفی نے زیرِ نظر موضوع ڈاکٹر گوہر نوشاہی بحیثیت محقق پر بہت عمدہ کام کیا ہے۔

تحقیق وتنقید کے تقاضوں کو پوری طرح نبھایا ہے۔ امید ہے کہ افضل صفی کا یہ کام علمی وادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

ڈاکٹر رشید امجد

✦

ڈاکٹر گوہر نوشاہی بحیثیت محقق بنیادی طور پر ایم فل کا مقالہ ہے جسے جناب محمد افضل صفی نے بڑی محنت اور توجہ سے لکھا ہے۔ مقالے کو تصنیفی صورت میں ڈھالنے کے لیے فاضل دوست نے بڑی مہارت سے کام لیا ہے اور اپنی لگن سے اسے ایک خوب صورت شکل دی ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے اب تک مطبوعہ مقالات سو سے متجاوز ہیں اور تصانیف وتالیفات کی تعداد چالیس کے قریب ہے۔ اس علمی سرمائے کا جناب محمد افضل صفی نے تفصیل کے ساتھ تعارف بھی کرایا ہے اور تجزیے کی بھی بھرپور کوشش کی ہے۔ اُردو تحقیق کے مجموعی تسلسل کو سامنے رکھتے ہوئے ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے مقام ومرتبے کا تعین، اُن کی تصانیف کی اہمیت اور تاریخِ ادب میں ان کی قدر وقیمت کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت وسوانح پر مستند مآخذ کی بنیاد پر بحث، اس کتاب کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ میں اس کارنامے پر برادرم محمد افضل صفی کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر شفیق انجم

پہلا باب

اُردو تحقیق کی روایت اور دبستانِ لاہور

تحقیق کیا ہے؟ تحقیق کے معنی کھوج، پرکھ، جانچ، چھان بین اور کھرے کھوٹے کو الگ الگ کرنے کے ہیں۔ تلاش و جستجو انسان کی فطرت میں روزِ ازل سے موجود ہے۔ وہ کائنات کی ہر چیز پر غور و فکر کرتا رہتا ہے۔ اس کے ذہن میں مختلف چیزوں سے متعلق مختلف سوالات جنم لیتے رہتے ہیں۔ انھی سوالات کے جواب تلاش کرتے رہنا تحقیق ہے۔

تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی تفتیش، درستی اور اصلیت معلوم کرنے کے ہیں۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں بار بار تلاش کو تحقیق کہا گیا ہے۔ تحقیق دریافت اور بازیافت کے ساتھ ساتھ ایک سائنسی طرزِ نظر بھی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ سائنس میں تحقیق ایجاد ہے جبکہ ادبی تحقیق دریافت، کھوج اور نکتہ رسی کا نام ہے۔ نایاب اور گوشۂ گم نامی میں چلے گئے متون کو تلاش کر کے منظرِ عام پر لانا بھی تحقیق ہے۔ پھر داخلی اور خارجی شہادتوں کی مدد سے درج شدہ کوائف اور معلومات کے غلط یا صحیح ہونے کا فیصلہ صادر کرنا اور حاصل شدہ حقائق یا نتائج کو باضابطہ طریقے سے پیش کر دینا تحقیق ہے۔ اس طرح تحقیق پہلے نامعلوم مواد کی تلاش، پھر تصدیق اور بعد میں تشہیر کا عمل ہے۔ ڈاکٹر گیان چند اپنی کتاب تحقیق کا فن میں ڈاکٹر تلک چند کی رائے پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> تحقیق علم کا وہ شعبہ ہے جس میں منظم لائحہ عمل کے تحت سائنسی اُسلوب میں نامعلوم و ناموجود حقائق کی کھوج اور معلوم و موجود حقائق کی نئی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ علم کے علاقے کی توسیع ہوتی ہے۔ (۱)

نامعلوم حقائق کی تلاش اور موجود معلومات کی از سرِ نو چھان پھٹک کر کے اس میں ترمیم یا

اضافہ کرنا تحقیقی عمل ہے۔ تحقیق دراصل کھرے اور کھوٹے کو الگ الگ خانوں میں رکھتی ہے۔ سچ کو جھوٹ کی آمیزش سے پاک کرتی ہے۔ تحقیق سچائی کی تلاش کا عمل ہے۔ اس کے لیے محنت اور ہمت کے ساتھ ساتھ تنقیدی شعور اور محققانہ مزاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ تحقیق میں قیاس آرائی سے کام نہیں چلتا، ہر بات ٹھوس اور مدلّل ثبوت کی بنیاد پر کہی جاتی ہے۔ اور اسی حیثیت میں وہ سائنس ہے۔ محقق میں غور و فکر کا خاص ملکہ ہونا چاہیے جس کی بنا پر وہ نئی نئی باتیں سوچ سکے۔ عبدالرزاق قریشی لکھتے ہیں:

> تحقیق میں قیاس آرائی کو دخل نہیں لیکن تخیل کی کارفرمائی ضروری ہے۔ تخیل محقق کے لیے اتنا ضروری ہے جتنا شاعر کے لیے۔ اس کی مدد سے وہ نئی نئی باتیں سوچ سکتا ہے، یہاں تک کہ مستقبل کو بھی دیکھ سکتا ہے۔ لیکن یہ تخیل منظم ہونا چاہیے۔ یہی منظم تخیل ہے جو تمام عظیم سائنسی اکتشافات میں کام کرتا ہے۔ جس شخص کے پاس تخیل نہیں وہ حقائق کو جمع تو کر سکتا ہے لیکن اکتشافات نہیں کر سکتا۔ (۲)

اُردو میں تحقیق کا آغاز تذکرہ نویسی سے ہوا۔ ابتدا میں اُردو شعرا کے تذکرے فارسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ دستیاب تذکروں میں سب سے پہلا تذکرہ میر تقی میر کا **نکات الشعرا** ہے۔ اس کے ساتھ ہی حمید اورنگ آبادی کا **گلشن گفتار** اور افضل بیگ قاقشال کا **تحفۃ الشعرا** تالیف ہوئے۔ ان تینوں تذکروں کا سنِ تالیف ۱۷۵۲ء ہے۔ گردیزی کا تذکرہ **ریختہ گویاں** اور قائم کا **مخزن نکات** ۱۷۵۵ء میں مرتب ہوئے۔ پھر تو اس طرز پر متعدد تذکرے لکھے گئے۔ یہ تمام تذکرے فارسی زبان میں ہیں۔ اُردو کا پہلا مفصّل تذکرہ جو لکھنؤ میں لکھا گیا وہ سعادت خان ناصر کا **خوش معرکۂ زیبا** ہے۔ یہ ۱۸۴۶ء میں تالیف ہوا۔ اس کے بعد قادر بخش صابر کا تذکرہ **گلستانِ سخن** ۱۸۵۵ء میں سامنے آیا۔ **انتخاب یادگار** امیر مینائی ۱۸۷۳ء اور محمد حسین آزاد کا تذکرہ **آبِ حیات** ۱۸۸۰ء میں وکٹوریہ پریس، لاہور نے شائع کیا۔ بعد کے تذکروں میں شعرا کے نام اور نمونہ کلام کے علاوہ اُن کے سوانح سے متعلق معلومات بھی شامل کی جانے لگی۔ اس سلسلے میں محمد حسین آزاد کی تصنیف آبِ حیات کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔

تذکروں کے علاوہ لغت نگاری میں بھی تحقیقی شعور کی ابتدائی کوششیں نظر آتی ہیں۔ سراج الدین علی خان آرزو کی لغت **نوادر الالفاظ** کو اُردو کی ابتدائی لغت کہا جاسکتا ہے۔ خان آرزو نے

عبدالواسع ہانسوی کی غرائب اللغات کی غلطیوں کی نہ صرف نشاندہی کی بلکہ اس کی تصحیح بھی کی۔اس طرح تحقیق کے دائرے میں وسعت پیدا ہوئی۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں مختلف ادبی انجمنیں اور علمی ادارے منظرِ عام پر آئے۔اُردو زبان وادب کے لیے جن کی خدمات نمایاں ہیں اِن میں انجمن پنجاب لاہور، سائنٹفک سوسائٹی غازی پور اور ادبی انجمن روہیل کھنڈ بریلی قابلِ ذکر ہیں۔اور علمی اداروں میں دہلی کالج اور فورٹ ولیم کالج کی خدمات قابلِ تحسین ہیں۔لیکن اِن انجمنوں اور علمی اداروں کی خدمات خالصتاً تحقیق کے زمرے میں نہیں آتیں۔۱۸۴۷ء میں سر سیّد کی کتاب آثارالصنادید کا پہلا ایڈیشن منظرِ عام پر آیا۔اسے ہم تحقیق کے نمونے کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔اِس کا موضوع ادبی تحقیق نہیں بلکہ آثار شناسی ہے۔پہلے ایڈیشن نے اُردو تحقیق کو نیا موضوع ضرور دیا لیکن اس میں جدید تحقیق کے واضع نشانات نہیں ملتے۔سر سیّد کا انداز جذباتی اور داستانی ہے۔اس ایڈیشن میں استدلالی طریقۂ کار اور روایت کو درایت کی کسوٹی پر پرکھنے کا فقدان ہے،لیکن خامیوں کے باوجود اسے پسند کیا گیا۔یہ سر سیّد کی تحقیق کا پہلا قدم تھا۔ایڈورڈ طامس، جو دہلی کے سیشن جج تھے،انھی کے کہنے پر سر سیّد نے اس پر نظرِ ثانی کی اور ۱۸۵۴ء میں آثارالصنادید کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔دوسرے ایڈیشن میں وہ تمام باتیں نکال دی گئیں جن پر داستانوی رنگ غالب تھا۔اس ایڈیشن میں سر سیّد کا انداز جذباتی یا داستانی کے بجائے مورّخانہ اور محققانہ ہے۔اس میں قاری کی سہولت کے لیے معلومات کے مآخذ اور ذرائع بھی بتا دیے گئے ہیں۔آثارالصنادید کا دوسرا ایڈیشن مغربی اندازِ تحقیق کا عکاس ہے۔اس کے دیباچے میں سر سیّد احمد خان لکھتے ہیں:

> پہلی کتاب (پہلا ایڈیشن) میں جو حال بیان کیا گیا تھا اس کی سند نہ تھی۔اب کی کتاب (دوسرے ایڈیشن) میں جو حال لکھا گیا ہے، اکثر اس کی سند کے لیے نام اس کتاب تاریخ کا،جس سے وہ حال لکھا گیا ہے،حاشیے پر مندرج ہے۔ (۳)

اس کے علاوہ سر سیّد کی مدوّن کردہ کتب میں آئینِ اکبری (۵۶-۱۸۵۵ء)،تاریخ فیروز شاہی (۱۸۶۲ء)،توزکِ جہانگیری (۱۸۶۴ء) اور تاریخ ہندوستان قابلِ ذکر ہیں۔سر سیّد نے متنی تدوین کے جدید اصولوں کو اپناتے ہوئے تحقیق کی ایک نئی روش کی بنیاد ڈالی۔سر سیّد کی آئینِ اکبری اہمیت کی حامل کتاب ہے۔سر سیّد کو آئینِ اکبری کے بہت سے قلمی نسخے دستیاب تھے۔

انھوں نے تمام دستیاب قلمی نسخوں کا موازنہ کیا، مختلف نسخوں کے اختلاف کو دُور کیا، اصطلاحات کی وضاحت کی، اصل متن میں جہاں جہاں جگہیں خالی رہ گئی تھیں وہاں وہاں مختلف قلمی نسخوں کی مدد سے کمی پوری کردی۔ نیز اس پر مفید حواشی بھی لکھ دیے تا کہ تفہیم میں آسانی ہو جائے۔ مولوی عبدالحق کہتے ہیں:

> سر سیّد کا یہ کام بھی حیرت انگیز ہے۔ جدید تحقیق و ترتیب سے اُس وقت ہمارے ہاں کوئی آشنا نہ تھا اور نہ ہی اس قسم کے کاموں کا کسی کو شوق تھا اور نہ کوئی قدر تھی۔ تاہم ژرف نگاہی، محنت و مشقت اور تحقیق و تلاش سے اس کام کو انجام دیا، آج کل بڑے سے بڑا محقق بھی اس سے زیادہ نہیں کر سکتا۔ (۴)

ہم سر سیّد احمد خان کو جدید تحقیق کا نقطۂ آغاز کہہ سکتے ہیں۔ وہ مغربی تہذیب کے اثرات کو شجرِ ممنوعہ نہیں سمجھتے تھے اور نہ ہی ان کے مزاج میں تقلید پرستی کا عنصر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سر سیّد نے مغربی طرزِ تحقیق کو اپناتے ہوئے جدید تحقیق کی بنیاد ڈالی۔ سر سیّد کی علمی و ادبی خدمات کے حوالے سے مولانا شبلی نعمانی نے ایک بار کہا تھا:

> ملک میں آج بڑے بڑے انشاء پرداز موجود ہیں جو اپنے مخصوص دائرہ مضمون کے حکمران ہیں لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سر سیّد کے بارِ احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو۔ بعض بالکل ان کے دامنِ تربیت میں پلے ہیں، بعض نے دور سے فیض اٹھایا ہے، بعض نے مدعیانہ اپنا الگ راستہ نکالا، تاہم سر سیّد کی فیض پروری سے بالکل آزاد کیوں کر رہ سکتے ہیں۔ (۵)

سر سیّد کے ساتھ اُن کے تین معاصرین حالی، شبلی اور آزاد کا ذکر بہت ضروری ہے۔ تحقیق کی پہلی مثال مولانا الطاف حسین حالی نے پیش کی۔ انھوں نے تین سوانح عمریاں لکھیں؛ حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید۔ اِن میں سے حیاتِ سعدی کا درجہ افضل ہے۔ حیاتِ سعدی پہلی بار ۱۸۸۲ء میں شائع ہوئی۔ حیاتِ سعدی میں حالی نے جو کچھ لکھا ہے اِس میں اب تک اضافہ نہیں ہو سکا۔ اسے مولانا حالی نے اپنے تحقیقی مزاج کے پیشِ نظر قدیم تذکروں، شیخ سعدی کے کلام اور دیگر شہادتوں کی مدد سے حیاتِ سعدی کی گمشدہ کڑیوں کو ملا کر مکمل کیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں:

حالی کی تحقیق بھی ہر ہر جگہ قابلِ ستائش ہے۔ ان کی کتابوں میں حیاتِ سعدی سب سے اہم ہے۔ اور یہی کتاب قابلِ تعریف بھی ہے۔ اس میں تحقیق کے بنیادی اصول کی پیروی کی گئی ہے کہ معلومہ مواد کو پوری طرح چھان بین کے بعد درج کیا ہے۔ اگرچہ سعدی پر اس سے زیادہ تحقیق ہو چکی ہے لیکن اس کی حیثیت اپنی جگہ پر ہے۔ (۶)

یادگارِ غالب (۱۸۹۷ء) لکھتے ہوئے حالی نے غالب کی تحریروں سے ان کے حالاتِ زندگی اور اخلاق و عادات کا اندازہ لگایا ہے۔ اس سلسلے میں غالب کے بعض دوستوں اور شاگردوں سے بھی مرزا غالب کے حالات جمع کیے ہیں جن میں منشی نبی بخش حقیر، منشی ہر گوپال تفتہ، میر مہدی مجروح اور نواب علاؤالدین کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں یادگارِ غالب لکھتے وقت حالی کے پیشِ نظر مولانا محمد حسین آزاد کی آبِ حیات بھی رہی ہے۔

حیاتِ جاوید (۱۹۰۱ء) سر سیّد احمد خاں کی سوانح عمری ہے۔ اس کی تالیف کے سلسلے میں حالی نے تہذیب الاخلاق، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، سرکاری رپورٹس، اخبارات، سر سیّد کے مکاتیب، لیکچرز، سر سیّد کی تصانیف اور دیگر تحریروں سے مواد حاصل کیا۔ اس کے علاوہ سر سیّد کے دوستوں سے زبانی حالات بھی جمع کیے جن کے حوالے حیاتِ جاوید میں موجود ہیں۔ یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید میں حالی نے اتنی محنت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ غالب حالی کے استاد تھے اور سر سیّد اُن کے قافلہ سالار۔ حالی خود نرم مزاج اور فطرتاً نفیس انسان تھے، کھل کر بات نہ کر سکے اس لیے اُن کی کتب میں بہت سی باتیں تشنہ رہ گئیں جو آج تحقیق کے طالب علم کو کھٹکتی ہیں۔ اس بات کا حالی خود بھی اعتراف کرتے ہیں:

> ہندوستان میں جہاں ہیرو کے ایک عیب یا خطا کا معلوم ہونا ان کی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بائیوگرافی کرٹیکل طریقہ سے لکھی جائے، اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں۔ چنانچہ اسی خیال سے ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اس سے پہلے ہے، اس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکیں، ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور اُن کے پھوڑوں کو ٹھیس نہیں لگنے دی۔ (۷)

یہاں ایک اشارہ تو غالب کی طرف ہے۔ وہ غالب کے پھپھولوں کو ٹھیس نہیں لگنے دینا چاہتے تھے۔ اس لیے بہت سی باتیں نظر انداز کر گئے ہوں گے۔ اسی طرح حیاتِ جاوید میں بھی کچھ خامیاں رہ گئی ہیں۔ حیاتِ جاوید پر تو ''مدلل مداحی'' اور ''کذب وافترا'' کے الزامات لگائے گئے۔ دراصل حالی اپنی فطری شرافت، وضع داری اور نرم مزاجی کے ہاتھوں مار کھا گئے ورنہ وہ بہت کچھ جانتے تھے جس کا اظہار نہ کر سکے۔

سوانح عمریوں کے علاوہ حالی کی چند اور کتابیں بھی ہیں جو انھوں نے مذہبی جذبے سے سرشار ہو کر لکھیں۔ ان میں خاص طور پر تریاقِ مسموم (۱۸۶۷ء) اور تاریخ محمدی (۱۸۷۲ء) قابلِ ذکر ہیں۔ یہ دونوں کتابیں مشہور نو عیسائی پادری عماد الدین کی تصانیف تحقیق الایمان اور تاریخ محمدی میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی ذاتِ گرامی پر اعتراضات کیے گئے تھے۔ حالی نے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ انھوں نے دلائل و براہین سے ثابت کیا ہے کہ پادری عماد الدین کی تالیفات روایاتِ مآخذ کے اعتبار سے درست نہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ثابت کیا ہے کہ پادری عماد الدین نے ترجمہ و نقل میں بھی دیانت داری سے کام نہیں لیا۔ مولانا حالی نے نہایت تحقیق و ژرف نگاہی سے انجیل، تورات، کلامِ مجید اور تاریخ کے حوالوں سے پادری صاحب کی تحقیق کو ناقص قرار دیا ہے۔

مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) نے تاریخ کو اپنا موضوع بنایا۔ شعر العجم فارسی شاعری کا تذکرہ ہے جو اُردو میں لکھا گیا ہے۔ اُردو داں طبقے کے لیے فارسی زبان کے ادوار سمجھنے کے لیے بہت اہم دستاویز ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے سوانح عمریاں بھی لکھیں جن میں المامون (۱۸۸۹ء)، سیرۃ النعمان (۱۸۹۱ء)، الفاروق (۱۸۹۹ء)، الغزالی (۱۹۰۲)، سوانح مولانا روم اور سیرۃ النبیؐ شامل ہیں۔ الفاروق مولانا شبلی نعمانی کا اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ یہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کے پہلے حصے میں حضرت عمرؓ کے حالاتِ زندگی بیان کیے گئے ہیں اور دوسرے حصے میں ان کے اوصافِ حمیدہ، علمی کمالات اور بطور منتظم ان کے اقدامات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے پہلے حصے میں بیانیہ اندازِ تحریر اختیار کیا ہے اور دوسرے حصے میں محققانہ طریق کار اپنایا ہے۔ الفاروق کی تالیف کے سلسلے میں انھوں نے ترکی، مصر، شام وغیرہ سے کتب اکٹھی کیں۔ واقعات کی چھان بین کے لیے اصول و ضوابط طے کیے۔ واقعات کو ''درایت'' کی کسوٹی پر

پرکھا۔ اس میں درج ذیل اصول اپنائے گئے ہیں:

۱۔ واقعہ مذکور اصول و عادات کی رو سے ممکن ہے یا نہیں؟

۲۔ اس زمانے میں لوگوں کا میلانِ عام واقعہ کے مخالف تھا یا موافق؟

۳۔ واقعہ اگر کسی حد تک غیر معمولی ہے تو اسی نسبت سے ثبوت کی شہادت قوی ہے یا نہیں؟

۴۔ اس امر کی تفتیش کہ راوی جس امر کو واقعہ ظاہر کرتا ہے اس میں قیاس و رائے کا کس حد تک دخل ہے؟

۵۔ راوی نے واقعہ جس صورت میں ظاہر کیا تھا، وہ واقعہ کی پوری تصویر ہے یا اس امر کا احتمال ہے کہ راوی اس کے ہر پہلو پر نظر نہیں ڈال سکا اور واقعہ کی تمام خصوصیتیں نظر نہ آسکیں۔

۶۔ اس بات کا اندازہ کہ زمانے کے امتداد اور مختلف راویوں کے طریقے نے اس روایت میں کیا کیا اور کسی قسم کے تغیرات پیدا کیے ہیں؟ (۸)

مولانا شبلی نعمانی کا ایک اور اہم تحقیقی کام سیرت النبیؐ ہے۔ اسے لکھتے وقت مولانا شبلی نعمانی نے نہ صرف تحقیقی اصولوں کو پیشِ نظر رکھا ہے بلکہ اس کے شروع میں ایک عمدہ مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں فنِ روایت، حدیث اور سیرت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں مولانا شبلی نعمانیؒ نے ایسی تمام بحثوں کو چھیڑا ہے جن میں آنحضرت ﷺ کی بشریت کے مدِ نظر غیر مسلم مورّخوں نے آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس پر طعن کیا تھا۔ سیرت النبیؐ میں شبلی نعمانی کی حضور پاک ﷺ سے محبت و عقیدت کھل کر سامنے آئی ہے۔ سر سیّد احمد خان کی خطباتِ احمدیہ میں بھی ایسی محبت و عقیدت کا اظہار ملتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سیّد عبداللہ:

> سیرت النبیؐ بنیادی طور پر ایک عاشقِ رسولؐ کا والہانہ اظہارِ عقیدت ہے۔ اس میں عشق و محبت کا وہی رنگ ہے جو خطباتِ احمدیہ میں نظر آتا ہے۔ (۹)

اِن سوانح عمریوں میں مولانا شبلی نے تحقیق کے اصولوں کو کافی حد تک سامنے رکھا ہے۔ مولانا شبلی نے کچھ تحقیقی مقالات بھی لکھے جن میں ''اسلامی کتب خانے''، ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم''، ''الجزیہ''، ''شفا خانے'' اور ''اسلامی حکومتیں'' شامل ہیں۔ شبلی مغربی زبانوں سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتے تھے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے تحقیق کے میدان میں عمدہ اثرات چھوڑے۔ مالک رام کہتے ہیں:

حیرت ہوتی ہے کہ ایک ایسا شخص جو پرانے ماحول میں پیدا ہوا، جس کی پوری تعلیم پرانے مکتبی انداز میں ہوئی، جسے مغربی زبانوں کی یونہی برائے نام شد بد تھی، اس نے تحقیق کے میدان میں ایسے دیرپا اثرات چھوڑے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ علی گڑھ کے قیام اور سر سیّد کی محنت کا فیضان تھا۔ (۱۰)

مولانا شبلی نعمانی کا تاریخ کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کا حافظ بہت اچھا تھا۔ لیکن اُن کے ہاں جو کمی رہ گئی ایک تو یہ کہ وہ اختلافی مسائل میں اپنی فیصلہ کن رائے دینے سے اجتناب کرتے تھے، دوسرا یہ کہ لکھتے لکھتے ان کی طبیعت انھیں رومانیت اور مبالغے کی طرف کھینچ لیتی تھی۔ شاعرانہ مزاج تحقیق کے لیے سازگار نہیں ہوتا۔ جب ہم محمد حسین آزاد کی آبِ حیات کو دیکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ زبان و بیان کے حوالے سے تو اپنی مثال آپ ہے لیکن تحقیقی نقطۂ نظر سے اس میں کافی خامیاں رہ گئی ہیں۔ تاہم یہاں تذکرہ نگاری اپنے نقطۂ عروج کو چھو کر تاریخِ ادب اُردو میں ڈھلتی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں پہلی بار تذکرہ نویسی اور تحقیقی شعور ہم آغوش ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہاں نکات الشعرا سے لے کر آبِ حیات تک ایک خاص نوعیت کے تذکروں کا دور مکمل ہوتا ہے۔ حالی، شبلی اور آزاد کی کاوشوں سے علمی و ادبی روایت کو کافی فائدہ پہنچا۔ ان میں شبلی اس لحاظ سے بہت اہم ہیں کہ ان کے شاگردوں نے اِن کی علمی روایت کو آگے بڑھایا اور اِس تسلسل کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ میں سے مولانا عبدالسلام ندوی کی شعرالہند، مولانا عبدالحیٔ کی گُلِ رعنا اُردو شعر و ادب کے حوالے سے اہم ہیں۔ عبدالسلام ندوی نے شعرالہند، شعرالعجم کے تتبع میں لکھی۔ اگر چہ اس معیار کو نہ پہنچ سکی پھر بھی اِس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی سیرت کی کتابیں، عمر بن عبدالعزیز اور امام رازی خاصے کی چیزیں ہیں۔ سیّد سلیمان ندوی نے ارض القرآن، عرب و ہند کے تعلقات، سیرۃ عائشہؓ اور خیام جیسی تحقیقی کتابیں لکھیں۔ ان کے علاوہ ایک سوانح عمری حیات شبلی کے عنوان سے لکھی۔ اُن کا کام تحقیق کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔

اعظم گڑھ کے ساتھ ساتھ حیدر آباد دکن بھی اُردو تحقیق کا اہم مرکز رہا ہے۔ اس میں مولوی عبدالحق، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر عبدالقادر سروری، نصیرالدین ہاشمی، حکیم شمس الدین قادری، ڈاکٹر مسعود حسن خان، ڈاکٹر حسینی شاہد، مبارز الدین رفعت، ڈاکٹر حفیظ قتیل، سخاوت مرزا، ڈاکٹر رقیہ

سلطانہ، آمنہ خاتون، اکبرالدین صدیقی اور ڈاکٹر فہمیدہ بیگم وغیرہ کی خدمات قابلِ تحسین ہیں۔

ڈاکٹر غلام محی الدین قادری زور اُردو تحقیق کے دبستانِ دکن کے نمائندہ محقق ہیں۔ ویسے تو ڈاکٹر زور نے بہمنی اور عادل شاہی دور کی کئی ادبی شخصیات کو گوشۂ گمنامی سے باہر نکالا لیکن صحیح معنوں میں ان کی تحقیق کے جوہر قطب شاہی دور کی تحقیقات میں کھلتے نظر آتے ہیں۔ ان کی تحقیقات نے اُردو ادب کی تاریخ کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کے اہم تحقیقی و تدوینی کارناموں میں تذکرۂ مخطوطات (پانچ جلدیں)، کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ، اُردو شہ پارے، گلزارِ ابراہیم مع گلشنِ ہند، ابراہیم نامہ، ارشاد نامہ، مکتوباتِ شاد عظیم آبادی اور طالب وموہنی وغیرہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر زور کے نزدیک تحقیق کے کسی گوشے کو نامکمل چھوڑنا نہ مناسب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جس موضوع پر کام کرتے اُسے مکمل کرنے کی کوشش کرتے۔ اُنھوں نے اپنی تحقیقات کو اسناد بخشنے کے لیے کافی صعوبتیں برداشت کیں۔ اورنگ آباد، بیدر، بے جاپور گلبرگہ کی مسافت طے کی اور حیدر آباد کے دیگر مواضعات کا سفر بھی کیا۔ ڈاکٹر زور ایسی بہت سی شخصیات کے ادبی کاموں کو ڈھونڈ کر سامنے لائے جو گوشۂ گمنامی میں جا چکی تھیں۔ انھوں نے نہ صرف ان شخصیات کی ادبی خدمات کو متعارف کروایا بلکہ ان کی ابدی خواب گاہوں تک کو ڈھونڈ نکالا۔ اس ضمن میں دکن کے مشہور شاعر میر شمس الدین فیض کے مزار کی مثال دی جا سکتی ہے۔ مخطوطہ شناسی کا شوق انھیں زمانہ طالب علمی سے تھا۔ اس فن میں وہ کمال مہارت رکھتے تھے مشکل سے مشکل قدیم دکنی مخطوطات بڑی آسانی سے پڑھ لیتے تھے۔ ایک کامیاب مخطوطہ شناس میں جن خصوصیات کا ہونا ضروری ہوتا ہے وہ ڈاکٹر زور کے مزاج میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ انھوں نے بہت سی قدیم دکنی تخلیقات کو متعارف کروایا اور تحقیق و تدوین کے رائج الوقت اصولوں کو مدِ نظر رکھا۔ ڈاکٹر زور کسی فن پارے کی ترتیب و تدوین میں اُس کے تمام نسخوں تک رسائی حاصل نہیں کرتے تھے بلکہ صرف دستیاب نسخوں پر ہی اکتفا کرتے، جس کی وجہ سے اُن سے کچھ فروگزاشتیں بھی ہوئیں۔ اس کی ایک مثال تو ہم ان کے مرتب کردہ دیوان کلیات قلی قطب شاہ کی دے سکتے ہیں جسے ڈاکٹر زور نے کتب خانہ سالار جنگ کے دو نسخوں کی مدد سے مرتب کیا ہے۔ کلیات قلی قطب شاہ کی ترتیب و تدوین کے وقت اُن کی نظر سے کلیات قلی قطب شاہ کا وہ نسخہ اوجھل رہا جو کسی وقت کتب خانہ آصفیہ کی ملکیت تھا، بعد میں آصف سابع کے کتب خانہ میں پہنچ گیا تھا۔ اس قدیم دیوان میں محمد قلی قطب

شاہ کی مشہور غزل موجود ہے:

پیا باج پیالہ پیا جائے نا　　پیا باج یک پل جیا جائے نا
پیا باج کیسے صبوری کروں　　کہا جائے آتا کیا جائے نا
قطب شہ نہ دے مجھ دوانے کو پند　　دوانے کو کچھ پند دیا جائے نا

یہ غزل کتب خانہ سالار جنگ کے دونوں نسخوں میں موجود نہیں۔ اس کا حوالہ صرف مولوی عبدالحق کے مضمون میں ملتا ہے جو مولوی صاحب نے کتب خانہ آصفیہ والے مکمل اور قدیم نسخے کے پیشِ نظر لکھا تھا۔ (۱۱)

اس کی دوسری مثال مثنوی طالب و موہنی کی تدوین ہے۔ اس کے بھی دو نسخے موجود تھے، ایک ادبیاتِ اُردو (حیدر آباد) کی ملکیت تھا اور دوسرا انڈیا آفس لندن کی۔ انڈیا آفس لندن والے نسخے تک ڈاکٹر زور رسائی حاصل نہ کر سکے اور ادارہ ادبیاتِ اُردو والے ایک ہی مخطوطے پر اکتفا کیا۔ اگر وہ انڈیا آفس لندن والے مخطوطے تک رسائی حاصل کر لیتے اور اس سے استفادہ کرتے تو ممکن تھا کہ مثنوی طالب و موہنی اور اس کے شاعر سیّد محمد دولہ کے بارے میں نئی معلومات حاصل ہو جاتیں۔ ان سب باتوں سے قطع نظر ڈاکٹر زور کی تحقیقی خدمات بلاشبہ اُردو تحقیق کی روایت میں وسعت اور پھیلاؤ کا سبب بنیں۔ اگر وہ یہ خدمات انجام نہ دیتے تو آج تاریخ اُردو ادب قدیم دکنی ادب سے متعلق بیش بہا معلومات سے محروم رہتی۔

دبستانِ دکن سے تعلق رکھنے والے محققین نے اُردو کے لسانی ارتقا کا جائزہ لیا، قدیم دکنی شعرا اور مصنفین کی کاوشوں کو منظرِ عام پر لانے کی کوششیں کیں۔ یہ قلمی نسخوں کے اختلاف میں نہیں پڑے بلکہ شعرا اور ادبا کے حالات تلاش کرنے میں انھوں نے بڑی حد تک مطبوعہ مواد پر قناعت کی، جس کی وجہ سے ان کے علمی کارناموں میں واقعات اور سنین کے مغالطے رہ گئے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر عبدالقادر سروری اور نصیر الدین ہاشمی نے تصحیحِ متن کا کام کیا اور اُردو کے لسانی ارتقا کا جائزہ لیا۔ مولوی عبدالحق نے اُردو تحقیق کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اُردو زبان کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ، مقدمات مولوی عبدالحق اور خطبات مولوی عبدالحق ان کے قابلِ قدر کام ہیں۔ جب انجمن ترقی اُردو (ہند) کا مرکز اورنگ آباد بنا تو ان کی توجہ دکنی ادب پر مرکوز ہو گئی۔ انھوں نے شعرا کے متعدد تذکرے اور دواوین بھی شائع کیے۔

مولوی عبدالحق تحقیق و تدوین میں مستند حوالوں اور شہادتوں کے قائل تھے۔ انھوں نے داخلی اور خارجی شہادتوں کی مدد سے اپنے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ ان کی تحقیق کی خوبی ہے کہ وہ دریافت کردہ یا تدوین کردہ کتب کے شروع میں ایک مبسوط مقدمہ لکھتے ہیں جس میں کتاب کے مصنف اور کتاب کے بارے میں خاطر خواہ معلومات فراہم کر دیتے ہیں وہ مصنف کے سوانحی حالات کے ساتھ اس کے عہد کی سیاسی اور سماجی اقدار پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ نہ صرف زیرِ بحث کتاب پر نیا مواد فراہم کرتے ہیں بلکہ مقدمے میں اس کتاب کے مصنف کی دیگر کتب کا بھی ذکر کر دیتے ہیں، جس سے کتاب کی تفہیم اور مصنف کے حالات جاننے میں مدد ملتی ہے۔

مولوی عبدالحق نے جن مصنفین کی کتب پر مقدمے لکھے ہیں ان کے حالات کافی حد تک سامنے آ گئے ہیں۔ اس ضمن میں تمدنِ ہند کے ترجمہ کی مثال دی جا سکتی ہے۔ تمدنِ ہند کے مقدمے کا ایک حصہ اس کے مترجم شمس العلما ڈاکٹر مولوی سیّد علی بلگرامی کے ذاتی حالات پر مشتمل ہے، جس میں مصنف کے نجی، خاندانی حالات کے ساتھ ساتھ ان کی تصانیف و تالیفات اور علمی و ادبی کارناموں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ مزید براں ان کے مقام و مرتبہ کا تعین کرنے کے بعد کتاب کے موضوع اور ترجمے کا تحقیقی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

مولوی عبدالحق نے تحقیق میں بعض مسلّمات کا رد کیا ہے۔ مثلاً مولوی صاحب سے پہلے محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں ولی دکنی کو اُردو شاعری کا باوا آدم قرار دیا تھا۔ یہ نقطۂ نظر بہت عرصہ تک تسلیم کیا جاتا رہا۔ مولوی عبدالحق نے مدلّل انداز میں اس نظریے کو رد کیا۔ انھوں نے رسالہ اُردو جنوری ۱۹۲۲ء کے شمارے میں اپنے ایک مضمون ''کلام قلی قطب شاہ'' میں ولی کی اوّلیت والے نظریے کو اس دعوے کے ساتھ باطل قرار دیا کہ ولی سے کہیں پہلے نہ صرف اُردو شاعری وجود میں آ چکی تھی بلکہ غزل میں تو غزل کے میدان کے شہسوار بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ولی سے پہلے غزل کے دو کامیاب دور گزر چکے تھے، پہلا دور امیر خسرو اور دوسرا دور قلی قطب شاہ کا تھا۔ پہلے دور میں دس شعرا اور دوسرے میں قلی قطب شاہ سے شاہ میراں تک چودہ شعرا کا ذکر ملتا ہے۔

مولوی عبدالحق نے نثر میں بھی بعض اہم انکشافات کیے۔ پرانی تحقیق کے نقطۂ نظر کو یکسر بدل دیا۔ مثلاً ایک عرصہ تک فضلی کی کربل کتھا کو اُردو کی پہلی کتاب تسلیم کیا جاتا رہا تھا۔ مولوی

صاحب نے ۱۹۳۲ء میں سب رس شائع کر کے اس نقطہ نظر کو بدل دیا اور یہ ثابت کیا کہ ملا وجہی کی سب رس، کربل کتھا سے پہلے کی نثری کتاب ہے۔ مولوی عبدالحق نے سب رس کی ترتیب وتدوین میں استعمال ہونے والے مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی پیش کر دی ہے جس کے دو فائدے ہوئے ہیں، ایک تو سب رس کی تفہیم آسان ہوگئی ہے اور دوسرا اس کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔

مولوی عبدالحق کے تحقیقی وتدوینی کاموں میں کچھ خامیاں بھی محسوس ہوتی ہیں۔ ان کی مدوّن کردہ اکثر کتب یکسانیت کا شکار ہیں۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے تحقیق وتدوین کے معیار کی طرف توجہ دینے کی بجائے زیادہ سے زیادہ کتابوں کے متن شائع کرنے پر زور دیا تا کہ اہل تحقیق وتدوین کے لیے زیادہ سے زیادہ مواد مہیا ہو سکے۔ مولوی عبدالحق ہر وقت علمی وادبی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ وہ بہ یک وقت کئی کئی محاذوں پر لڑ رہے تھے، جس کی وجہ سے تحقیق کا حق ادا نہ ہو سکا۔ تحقیق یکسوئی چاہتی ہے۔ رشید حسن خان کہتے ہیں:

> وہ بہ یک وقت کئی محاذوں پر کام کیا کرتے تھے...... انھوں نے تحقیق کی طرف بھی توجہ کی اور تدوین کا کام بھی کیا ہے اور یہ واقع ہے کہ انھوں نے نہایت اہم تذکروں اور قدیم متون کو شائع کیا اور اس طرح کام کرنے کا ڈول ڈالا کہ لوگوں کو ان امور سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ لیکن بات وہی کہ تحقیق شرک گوارہ نہیں کرتی۔ آدمی اگر چو مکھی لڑے گا تو اور موضوعات کا حق چاہے ادا ہو جائے، تحقیق کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے جس انہماک اور ڈوب جانے والی کیفیت کی ضرورت ہوتی ہے، ہنگامہ آلود زندگی اس کے منافی ہے۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ وہ اکثر دوسروں سے بھی اپنے کام میں مدد لیا کرتے تھے لیکن کتابوں پر نام انھی کا ہوتا تھا۔ یہ سچ ہو یا جھوٹ لیکن یہ واقع ہے کہ جن متون پر ان کا کام بحیثیت مدون درج ہے، ان میں آداب تدوین کی پابندی کم نظر آتی ہے۔ یہی حال تحقیقی مقالات کا ہے۔ اس کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ ان کی تقلید میں تدوین اور تحقیق دونوں کو آسان کام سمجھا گیا۔ (۱۲)

ان سب باتوں سے قطع نظر مولوی عبدالحق نے متعدد قدیم متون کو متعارف کروا کر اُردو ادب کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ دکنی محققین زبان کو فلالوجی کی حدود سے نکال کر

صوتیات کی منزل تک لے آئے۔ انھی کی وجہ سے زبان کا صوتیاتی شعور ایک مستقل اور سائنٹفک علم کی حیثیت اختیار کر گیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں:

> اس علمی مرکز نے دکنیات کے ذخیرے کو زندہ کیا اور لسانیات کو فلالوجی کی حدود سے نکال کر صوتیات کے علم سے ملا دیا۔ ڈاکٹر زور کی کتابیں ہندوستانی لسانیات اور Daccani Phonetics بہت اہم ہیں۔ لسانیات کا علم ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے گہرائی اور توانائی حاصل کرتا ہے۔ آگے چل کر اس ذہنی رجحان نے ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر مسعود حسین خان کے لیے لسانیات کو مستقل موضوع بنایا۔ (۱۳)

دکنی مصنّفین کا غالب رجحان ادبی تحقیق کی طرف رہا۔ دکنی مصنّفین اُردو کے قدیم ذخائر کو سامنے لائے اور لسانی اعتبار سے انھوں نے زبان کے ارتقا کا جائزہ لیا۔ اس کے مقابلے میں دارالمصنّفین سے منسلک محققین کی تحقیق نے مذہبی رجحانات کا جائزہ لیا۔ شبلی کے شاگردوں نے متون کی تدوین و تالیف کی نسبت اخذ و ترجمہ کی طرف زیادہ توجہ دی۔ شبلی کی بصیرت نے ان کا رُخ تاریخ کے راستے، ادب کی طرف موڑ دیا۔ یہ مصنّفین عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو زبان و ادب کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنی ساری توجہ مشرقی علوم کی ترویج پر مرکوز کر دی۔ اس لحاظ سے انھوں نے اُردو کی نشو و نما، اُردو زبان کے طور پر نہیں کی بلکہ مسلمانوں کی علمی زبان کے طور پر کی ہے۔ اس سلسلے میں سیّد سلیمان ندوی، صباح الدین عبدالرحمٰن، عبدالسلام ندوی، مولانا عبدالحیٔ اور عبدالماجد دریابادی کی خدمات قابلِ تحسین ہیں۔

دلّی، لکھنؤ، حیدر آباد (دکن)، اعظم گڑھ، پٹنہ، رام پور اور لاہور تحقیق کے اہم مراکز رہے ہیں۔ انھیں ہم الگ الگ دبستانوں کے نام بھی دے سکتے ہیں۔ ان دبستانوں کے تحقیقی کارناموں نے اُردو ادب کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہمارے سامنے لا کر رکھ دیا۔ قدیم متون کو انتہائی محنت اور جانفشانی سے تلاش کیا گیا۔ انتہائی احتیاط سے ان کی تدوین کی گئی۔ دبستانِ پٹنہ میں قاضی عبدالودود، ڈاکٹر اختر اورینوی اور مختار الدین آرزو کی خدمات نمایاں ہیں۔ دبستانِ پٹنہ کے حوالے سے قاضی عبدالودود کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اُردو تحقیق کے لیے انھوں نے بہت کام کیا۔ بیسیوں مقالے لکھے، کتابوں پر تبصرے کیے، اُردو شعرا اور ادبا کے حالات لکھے۔ اُن کا

ایک طویل تحقیقی مقالہ ''غالب بحیثیت محقق'' کے عنوان سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس مقالے کے پڑھنے سے غالب کے تحقیقی شعور سے متعلق کافی معلومات ملتی ہیں۔ قاضی صاحب کے تنقیدی مقالات کے دو مجموعے **عیارستاں** اور **اشتر و سوزن** چھپ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے **دیوانِ شورش** اور **تذکرہ امین اللہ طوفان** کو مفید حواشی کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا۔ قاضی عبدالودود نے تحقیق میں احتساب کی روایت کو حافظ محمود شیرانی کی طرح قائم رکھا۔ وہ دبستانِ پٹنہ کے روح و رواں ہیں۔ دبستانِ پٹنہ کی تحقیق کے نمایاں رجحانات میں سے ایک تو یہ ہے کہ انھوں نے ثانوی مآخذ کو سرے سے صرفِ نظر کر دیا اور دوسرا یہ کہ حوالہ دینے میں انتہائی محتاط رویہ اختیار کیا۔ تیسرا یہ کہ انھوں نے مخففات کا استعمال بہت زیادہ کیا جس کا نقصان یہ ہوا کہ مخففات کے بے دریغ استعمال سے تحریر کا حسن ماند پڑ گیا۔

دبستانِ رام پور کے اہم ترین محقق مولانا امتیاز علی عرشی ہیں۔ اس دبستان کے محققین نے زیادہ تر تصحیح متن کا کام کیا اور ترتیب و تحشیے میں تذکروں کے استعمال کا نیا اُسلوب اپنایا۔ مولانا امتیاز علی عرشی کا غالب کے حوالے سے گراں قدر کام موجود ہے۔ انھوں نے غالب کے نوابانِ رام پور کے نام خطوط کو بڑی محنت اور جستجو سے حاصل کیا اور ایک فاضلانہ مقدمے کے ساتھ **مکاتیب غالب** کے نام سے شائع کر دیا۔ انھوں نے ایک اور اہم کام یہ کیا کہ غالب نے جو اپنے فارسی اور اُردو کلام کا انتخاب کیا تھا، اسے بڑی محنت سے تلاش کیا اور **انتخابِ غالب** کے نام سے اسے کتابی صورت دی۔ عرشی صاحب نے **دیوانِ غالب نسخۂ عرشی** میں غالب کے تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ اشعار کو اکٹھا کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے علی احمد یکتا کا تذکرہ **دستور الفصاحت** نہایت عمدہ مقدمے کے ساتھ مرتب کیا اور شاہ عالم ثانی کے اُردو، ہندی، فارسی اور پنجابی کلام کا مجموعہ **نادرات شاہی** کے عنوان سے خوبصورت دیباچے کے ساتھ شائع کیا۔ انشاءاللہ خان انشاء کی بے نقط نثری کہانی **سلکِ گوہر** کی ترتیب و اشاعت کا سہرہ بھی انھی کے سر ہے۔ اُن کے تحقیقی مقالات **مقالاتِ عرشی** کے نام سے شائع ہو چکے ہیں اور **فرہنگ غالب** بھی ان کی ایک عمدہ کتاب ہے۔ قصہ مختصر، مولانا امتیاز علی عرشی دبستانِ رام پور کی پہچان ہیں۔

اُردو تحقیق کے دبستانوں کی یہ تقسیم زمانی اور مکانی لحاظ سے تھی۔ اہم بات یہ ہے کہ اس تقسیم کے تحت اگر تحقیق کو دبستانوں میں تقسیم کیا جائے تو دلی اور لکھنؤ کے علاوہ پانچ دبستان قیامِ

پاکستان سے پہلے ہی سامنے آ چکے تھے۔ انھی میں سے ایک اہم بلکہ سب سے اہم تحقیقی دبستان، دبستانِ لاہور ہے، جو اپنے خصائص اور امتیازات کے سبب اُردو تحقیق کے سب دبستانوں سے منفرد اور وقیع ہے۔ اگر ہم فکری حوالے سے تحقیق کو دبستانوں میں تقسیم کرنا چاہیں تو اسے تین دبستانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دبستانِ تالیفی، دوسرا انتقادی اور تیسرا تکنیکی کہلائے گا۔ تالیفی دبستان کی ابتدا سرسیّد سے ہوتی ہے۔ اس میں سرسیّد کے ساتھ شبلی، مولوی عبدالحق، مسعود حسن خان، ڈاکٹر گیان چند اور اس طرز پر چلنے والے دیگر محققین شامل ہیں۔

تحقیق کے انتقادی دبستان میں ڈاکٹر لائٹنر، حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر سیّد عبداللہ، قاضی عبدالودود، رشید حسن خاں، ڈاکٹر وحید قریشی، مشفق خواجہ اور بیشتر ایسے محققین شامل ہیں جنھوں نے حقائق کی تشریح و توضیح کرنے کو تحقیقی عمل میں اہمیت دی۔ تکنیکی دبستانِ میں مولانا حالی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور اس طرز پر چلنے والے دیگر محققین شامل ہیں۔ قیام پاکستان سے پہلے محققین صرف اُردو تحقیق سے نہیں بلکہ فارسی اور عربی تحقیق سے بھی جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے بیشتر کارناموں کو پانچ اہم حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ متون کی ترتیب و تصحیح

۲۔ تاریخ ادب کے غیر معلوم گوشوں کی دریافت

۳۔ شعرا اور ادبا کے حالاتِ زندگی

۴۔ زبان کے آغاز و ارتقا کی نشاندہی

۵۔ اُن علوم کی بازیافت جو مسلمانوں کے علوم اور معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد اور قیام پاکستان سے پہلے تحقیق کی ضرورت و اہمیت کا احساس شدت سے بڑھا۔ یہ وہ دور ہے جس میں تحقیق کے بنیادی اصولوں کے پیشِ نظر تحقیق کے میدان میں خاطر خواہ کام ہوا۔ اِس سلسلے میں جن بزرگوں کے کارناموں کو ہمیشہ کے لیے یاد رکھا جائے گا اُن میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور، عبدالسّلام ندوی، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، سیّد سلیمان ندوی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی، وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے بارے میں وحید قریشی رقم طراز ہیں:

......یہی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے صحیح معنوں میں ریسرچ کا آغاز کیا۔ اُردو،

فارسی اور عربی کے سرمائے کو بند الماریوں سے نکالا۔ متون کی ترتیب و تصحیح کی۔
تاریخ ادب کی گمشدہ کڑیوں کو دریافت کیا۔ زبان کے آغاز وارتقا کی نشاندہی
کی۔ ادبا اور شعرا کے حالات و واقعات کو متعین کیا۔ اور وہ سرمایہ فراہم کیا جس
سے تاریخ ادب کی تدوین کا کام ممکن نظر آئے۔ (۱۴)

قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت کے عمل نے تخلیقی، علمی اور تحقیقی فضا کو بہت متاثر کیا۔ بہت سے اہلِ علم و دانش ہجرت کر کے پاکستان آئے اور پاکستان کے علمی اور تحقیقی سرمائے میں اضافے کا سبب بنے۔ ہجرت کرنے والوں میں سے اکثر محققین کراچی آباد ہوگئے۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے قائم کردہ کتب خانہ ''انجمن ترقی اُردو'' نے اُنھیں ایک جگہ پر اکٹھے ہونے کے مواقع فراہم کیے۔ اس طرح اُردو تحقیق کی روایت میں دبستانِ کراچی کا اضافہ ہوگیا۔ کتب خانہ انجمن ترقی اُردو نے دبستانِ کراچی کو سہارا دیا۔ مولوی عبدالحق پاکستان میں علم و ادب کے بہت بڑے محسن مانے جاتے ہیں۔ ان کی تحریک نہ صرف اُردو زبان کی گسترش کا سبب بنی بلکہ تحقیقی عمل کو آگے بڑھانے کا موجب ٹھہری۔

برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے بعد پاکستان میں تحقیق کی روایت قدرے سست روی کا شکار رہی۔ ناقص تعلیمی منصوبہ بندی، تحقیقی وسائل کی کمی، عمدہ لائبریریوں کا فقدان، علمی ذخائر کی عدم دستیابی، نقادوں کا تحقیق کو تنقید کے منافی قرار دے دینا، یہ ایسے بھیانک مسائل تھے جن کی وجہ سے تحقیق کے لیے خاطر خواہ ماحول پیدا نہ ہوسکا۔ قیام پاکستان کے بعد سرکاری اور قومی سطح پر متعدد انجمنیں اور ادارے وجود میں آئے جنھیں خالصتاً تحقیق کے مقاصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بنایا گیا تھا۔ اِن اداروں نے کسی نہ کسی طرح تحقیقی کام کو جاری رکھا۔ اِن میں سے مجلس ترقی ادب، لاہور؛ مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور؛ اقبال اکیڈمی، کراچی؛ مرکزی اُردو بورڈ، لاہور؛ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی؛ اُردو اکیڈمی، بہاول پور؛ اور پشتو اکیڈمی، پشاور وغیرہ کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ اب تک تحقیق کے جتنے دبستانوں کا ذکر ہو چکا ہے سبھی نے اپنے اپنے دائرۂ کار میں رہتے ہوئے تحقیقی کارنامے سرانجام دیے۔

اب دبستانِ لاہور کی طرف آتے ہیں۔ ویسے تو قیام پاکستان سے پہلے اِس سرزمین کے ہر خطے اور ہر صوبے میں علم و دانش کی درخشاں روایات موجود تھیں، اس خطے کے کونے کونے پر

کتب خانے موجود تھے۔ان میں سے بہت سے کتب خانے تو اساتذہ اور محققین کی ذاتی ملکیت تھے۔ان کے علاوہ اسلامی مدارس اور خانقاہیں علم و دانش کا مرکز جانی جاتی تھیں۔ ہر قدیم خانقاہ میں ایک عظیم کتب خانہ ہوا کرتا تھا، بالخصوص لاہور تو قیامِ پاکستان سے پہلے پورے برصغیر میں اپنی علمی و ادبی خدمات کا لوہا منوا چکا تھا۔قیامِ پاکستان سے پہلے یونیورسٹیوں کی تعداد کم تھی۔پنجاب یونیورسٹی میں تحقیقی روایت کا آغاز ہو چکا تھا۔ادبی تحقیق کے نقطۂ نظر سے پنجاب یونیورسٹی تحقیق اور ترتیب کا اہم مرکز تھی۔پنجاب یونیورسٹی سے وابستہ یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور نے تو اپنے منفرد اُسلوب اور معیار کے اعتبار سے پورے برصغیر میں اپنی الگ شناخت پیدا کر لی تھی۔ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں:

> قیامِ پاکستان سے قبل جامعہ پنجاب سے متعلق اورینٹل کالج، لاہور نے ایک مکتبۂ فکر کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ جسے اپنے اُسلوب اور معیار کے اعتبار سے تمام برصغیر میں امتیاز حاصل تھا۔اس مکتبۂ فکر کو اُردو کا دبستانِ لاہور کہا جاتا ہے۔اس دبستان نے علمی و سوانحی تحقیق کی جو بنیاد اہلِ علم کو فراہم کی اس کی مثال اُردو ادب کی کسی دوسری تحریک میں نہیں ملتی۔ (۱۵)

تحقیق کے دبستانِ لاہور نے اپنی بعض منفرد خصوصیات کی بنا پر دنیائے تحقیق میں اہم کردار ادا کیا۔اس طرزِ تحقیق کا آغاز قیامِ پاکستان سے کچھ عرصہ پہلے سنسکرت زبان سے ہوا۔اس سلسلے میں مسٹر وولنر کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔آگے چل کر حافظ محمود شیرانی نے اس کا رُخ فارسی اور اُردو کی وساطت سے مسلمانوں کے علوم کی طرف موڑ دیا۔ان کے ساتھ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع اور ڈاکٹر محمد اقبال نے کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی دبستانِ لاہور کو حیدر آباد اور اعظم گڑھ کے بعد تیسرا بڑا دبستانِ تحقیق قرار دیتے ہیں۔ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی لکھتے ہیں:

> اُردو میں تحقیق کا تیسرا اور سب سے جاندار مرکز لاہور ہے۔یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ لاہور میں جدید یا مغربی طرزِ تحقیق کا آغاز سنسکرت سے ہوا۔اس سلسلے میں مسٹر وولنر کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔آگے چل کر لاہور میں جن حضرات نے تحقیقی کارنامے سرانجام دیے انھوں نے اپنی توجہ فارسی اور اُردو کی وساطت سے مسلمانوں کے علوم پر مرتکز کر دی۔اِن لوگوں نے اپنے اندازِ تحقیق میں تاریخ

کو بنیادی حیثیت دی اور متعدد معاشرتی علوم کی وساطت سے ادب کے مختلف رشتے دریافت کیے۔ (۱۶)

حافظ محمود شیرانی ۱۸۸۰ء میں ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر فارسی میں ابتدائی تعلیم کا آغاز کیا۔ اس کے بعد ۱۹۰۱ء میں بیرسٹری کی سند لینے کے لیے ولایت چلے گئے۔ ان کے ولایت جانے کے کچھ عرصہ بعد سر شیخ عبدالقادر اور ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی ولایت پہنچ گئے۔ وہاں شیرانی صاحب اور اُن کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ انھوں نے ولایت میں سب سے پہلے انگریزی سیکھی پھر ایک آدھ امتحان قانون کا بھی دیا۔ ابھی تعلیم جاری تھی کہ ٹونک میں ان کے والدِ محترم کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد اخراجات کے حوالے سے ہاتھ کافی تنگ ہو گیا۔ آخر کار حافظ محمود شیرانی کو ۱۹۱۳ء میں واپس ہندوستان آنا پڑا۔ بعد میں ولایت واپس جانا چاہتے تھے کہ پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء - ۱۹۱۸ء) شروع ہو گئی۔ اب سمندری سفر ممکن نہ تھا، اس لیے وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ سات آٹھ سال بیکاری کے عالم میں ٹونک میں گزار دیے پھر حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر ۱۹۲۱ء میں لاہور چلے آئے۔ یہاں اپنے دیرینہ دوست شیخ عبدالقادر (مدیر مخزن) کی وساطت سے اسلامیہ کالج، لاہور میں فارسی اور اُردو کے استاد کے طور پر کام کرنے کا موقع مل گیا۔ اُس وقت مشاہرہ صرف ڈیڑھ سو روپے ملتا تھا جو بہت قلیل تھا۔ لیکن صبر و قناعت ان کی شخصیت کا حصہ تھے۔ وہ اِس قلیل معاوضے پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۲۸ء تک وہ اسلامیہ کالج، لاہور سے وابستہ رہے۔ پھر اسی سال اورینٹل کالج، لاہور میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں اُردو کے مدرس کے طور پر تقریباً بارہ سال تک اپنی خدمات انجام دیں۔ آخر ۱۹۴۰ء میں یہاں سے سبک دوش ہو گئے اور فروری ۱۹۴۶ء میں دمے کی وجہ سے ٹونک ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ (۱۷)

حافظ محمود شیرانی کو دبستانِ لاہور کا بانی کہا جا سکتا ہے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ تمام اسلامی ممالک کی تاریخ سے شناسائی رکھتے تھے۔ انھوں نے تاریخ کی مدد سے ادب کے دریافت شدہ مواد کو نئے سرے سے پرکھا اور تاریخ کے ساتھ ساتھ مختلف زبانوں کے مطالعے پر زور دیا۔ وہ نہ صرف عربی اور فارسی زبان و ادب کے فاضل تھے، بلکہ فارسی کی مختلف شاخوں پر بھی انھیں استادانہ مہارت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ انگریزی سے بھی کچھ واقفیت حاصل کر لی تھی۔ خطاطی،

مصوری اور نقاشی تو ان کے لیے محبوب موضوعات کی حیثیت رکھتے تھے۔ تحقیقی بصیرت کا یہ عالم تھا کہ قلمی نسخہ دیکھ کر اس کا عہد بتا دیتے۔ کاغذ اور روشنائی کی قدامت سے اس کے زمانے کا اندازہ لگا لیتے کہ یہ کاغذ کس زمانے کا ہے، اس کا عہد کون سا ہے اور اس میں جو روشنائی استعمال کی گئی ہے ایسی روشنائی کس زمانے میں استعمال کی جاتی تھی۔ وہ رسم الخط سے اندازہ لگا لیتے کہ یہ کس کاتب کا لکھا ہوا ہے۔ بعض اوقات تو کاتب کا نام بھی بتا دیتے۔ حافظ محمود شیرانی بڑے بت شکن تھے، بڑی بڑی شخصیات بھی ان کے محاسبے سے نہ بچ سکیں۔ ان کے پیروکار محققین نے بھی تحقیق میں احتساب کا یہی راستہ اپنایا۔ شیرانی صاحب نے تحقیق میں مختلف زبانوں کے مطالعے کو بہت اہمیت دی۔ انھوں نے تحقیق کے لیے صحافتی اور شاعرانہ زبان کے بجائے علمی اور تحقیقی زبان کی بنیاد ڈالی۔ مشرقی علوم کی برتری دلائل و براہین سے واضح کی۔ وہ صحیح معنوں میں محقق اور دبستانِ لاہور کے معلّم اوّل تھے۔ حافظ محمود شیرانی کے ساتھ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع اور پروفیسر محمد اقبال کی خدمات کا ذکر بھی ضروری ہے۔

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع ۱۶/ اگست ۱۸۸۳ء کو قصور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۶ء میں ایم۔ اے (عربی) میں اوّل پوزیشن حاصل کی اور حکومت ہند کی طرف سے وظیفے پر انگلستان چلے گئے۔ کیمبرج یونیورسٹی سے ایم۔ اے انگریزی کیا۔ انگلستان سے واپسی پر پنجاب یونیورسٹی میں عربی ادبیات کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۲ء اورینٹل کالج، لاہور کے پرنسپل رہے۔ ۱۹۴۲ء میں حکومت برطانیہ نے انھیں ''خان بہادر'' کا خطاب عطا کیا۔ ۱۹۵۰ء میں جب پنجاب یونیورسٹی نے دائرۃ المعارف، اُردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی ترتیب و تدوین کا منصوبہ بنایا تو مولوی صاحب کو اس شعبے کا صدر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۵۳ء میں ثقافتی وفد کے سربراہ کی حیثیت سے ایران کا دورہ کیا۔ ۱۹۵۳ء میں حکومت ایران نے انھیں نشانِ دانش درجہ اوّل اور ۱۹۵۵ء میں نشانِ سپاس درجہ اوّل عطا کیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے مختلف انتظامی اداروں کی سربراہی کی۔ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کمیٹی، انجمن حمایت اسلام اور مجلس اقبال کے رکن رہے۔ ۱۹۵۹ء میں حکومت پاکستان نے ستارۂ پاکستان کا اعزاز دیا۔ انھوں نے ۱۵/ مارچ ۱۹۶۳ء کو وفات پائی۔[(۱۸)]

مولوی محمد شفیع نے انتہائی محنت سے عقد الفرید کے تفصیلی اشاریے تیار کیے جو تحقیق و ترتیب و تحشیہ کی تاریخ میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ اِس کے علاوہ تذکرہ میخانہ عبدالنبی، مطلع سعدین،

مکاتیب رشیدی کو انھوں نے حواشی و فرہنگ کے ساتھ شائع کیا۔ ان کے متعدد مقالات موجود ہیں۔ تدوین میں ان کا ایک اہم کارنامہ مثنوی وامق وعذرا کی دریافت اور تدوین بھی ہے۔ ان کا زیادہ کام عربی اور فارسی میں ہے، تاہم دبستانِ لاہور کی روایت کو آگے بڑھانے میں ان کا بہت اہم کردار ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال ۱۶/ اگست ۱۸۹۶ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۱۲ء میں فیروز پور سے میٹرک کیا۔ اس کے بعد انٹرمیڈیٹ، ایم.اے. او کالج علی گڑھ سے کیا۔ الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی.اے کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۱۸ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایم.اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد حکومتِ ہند کے وظیفے پر انگلستان چلے گئے۔ ۱۹۲۲ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے پی ایچ.ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے پی ایچ.ڈی کے مقالے کا عنوان تھا، ''سلجوقی خاندان کی تاریخ راحت الصدور''۔ اس کے بعد انھوں نے ڈاکٹر کرسٹن کی کتاب کا ترجمہ ایران بہ عہد ساسانیان کیا۔ ۱۹۳۵ء میں آپ ایران چلے گئے اور واپس آکر ایران کی ادبی و تعلیمی سرگرمیوں پر پنجاب یونیورسٹی میں پانچ لیکچر دیے۔ ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس بنارس میں منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کے عربی اور فارسی سیکشن کی صدارت کے فرائض انجام دیے۔ پنجاب یونیورسٹی میں انگریزی اور اُردو پڑھاتے رہے۔ آخری عمر میں یونیورسٹی اورینٹل کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے اور مئی ۱۹۴۸ء میں وفات پائی۔ دبستانِ لاہور کے حوالے سے ان کی تحقیقی خدمات بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ (۱۹)

دبستانِ لاہور کی تحقیقی روایت دوسرے دبستانوں کے مقابلے میں زیادہ ٹھوس اور مدلل انداز کی حامل ہے۔ اس روایت سے تعلق رکھنے والے ادبا اور محققین نے تحقیق میں معیار کو اوّلیت دی۔ سہل انگاری کی بجائے ریاضت کو اپنایا۔ شاعرانہ اور صحافتی اندازِ بیان کی جگہ خالص تحقیقی اندازِ بیان اختیار کیا۔ پہلے سے معلوم شدہ معلومات کو نئے سرے سے پرکھا۔ فراموش شدہ مصنفین کے حالات معلوم کرنے کے لیے عہد بہ عہد کڑیاں ملائیں۔ کئی مسلمہ ادبی مفروضوں کی بے رحمانہ چھان بین کی۔ بنیادی اور ثانوی مآخذ کے استعمال میں فرق واضح کیا۔ وہ نسخوں کی قدامت کے تعین، کاغذ کی قدامت کی پہچان، حوالے کے اندارج، غرضیکہ ایک ایک چیز اور ایک ایک قدم پر انتہائی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ جب تک کسی بات کی تہ تک نہ پہنچ جاتے۔ اصلی

مآخذ کی داخلی اور خارجی شہادت نہ حاصل کر لیتے، اس وقت تک قلم نہ اٹھاتے۔ اُن کی تحقیق بے باک اور دوٹوک ہوتی تھی۔ ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں:

تحقیقی کام میں غفلت یا عدم احتیاط جرائم میں داخل تھی اور ایسے مواقع پر ان کی گرفت سخت ہوتی تھی۔ اس محاسبے کی زد میں بعض بڑی بڑی شخصیتیں بھی آتی تھیں، چاہے سلمان ندوی ہوں یا پروفیسر حبیب۔ ان کی کڑی تنقید معاف کرنا نہیں جانتی تھی۔ (۲۰)

دکنی مصنّفین کی تحقیقات ادبی حوالے سے تھیں۔ اور دارالمصنّفین نے مذہبی رجحانات کو اپنی تحقیق کا مرکز بنایا۔ دارالمصنّفین کے ادبا اور محققین کی طرح دبستانِ لاہور کی علمی روایت سے تعلق رکھنے والے محققین نے مشرقی علوم کی برتری کے لیے کام کیا۔ دبستانِ لاہور کا آغاز جو سنسکرت زبان سے ہوا تھا، وولنر کے بعد سنسکرت کی جگہ عربی، فارسی اور اُردو نے لے لی۔ ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں:

یہاں سنسکرت اور آریائی زبانوں کا لسانی مطالعہ وولنر کے بعد سے محدود ہو گیا اور اس کی جگہ عربی، فارسی اور اُردو ادب کے مطالعے میں صرف کہیں کہیں فلالوجی کی جھلک پائی جاتی ہے، ورنہ اِن محققین نے لفظوں کے نسب نامے اور زبانوں کے شجرے بنانے کے بجائے مسلمانوں کے علوم کو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ اس تگ و دو میں قلمی کتابوں کے متن ترتیب دینے کو اہم جانا۔ یہاں کیمبرج کی روایت زیادہ استعمال میں آئی اور معمولی سے معمولی اختلافِ نسخ کو بھی حواشی میں جگہ دی گئی۔ (۲۱)

دبستانِ لاہور کے محققین نے تحقیق کو جستجو اور دریافت کا عمل قرار دیا۔ انھوں نے تحقیق کو سائنٹفک طریق کار کے طرز پر اپنایا۔ تحقیق میں نئے مآخذ تلاش کیے، معلوم شدہ اور پرانے حقائق کو بنیاد بنا کر نئے حقائق تلاش کیے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر روبینہ ناز رقم طراز ہیں:

انھوں نے تحقیق کو جستجو اور دریافت کا عمل قرار دے کر اسے سائنسی طریق کار کے طرز پر اپنایا اور جدید سائنٹفک اصولوں پر سوانح اور متون کو درست کیا اور ان کی ترتیب و تصحیح کی۔ پروفیسر شیرانی، مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر اقبال جیسے اکابرین نے

ریاضت اور تحقیق کو لازم و ملزوم قرار دیا۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے اُردو، فارسی، عربی
ہر سہ زبانوں کے بارے میں تحقیقی اور علمی کام کیا۔ دیگر علوم سے گہری شناسائی
نے ان کی تحقیق میں وسعت اور گہرائی پیدا کی۔ [۲۲]

ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی اُردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں تحقیقی خدمات قابلِ تحسین ہیں۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ ۵/اپریل ۱۹۰۶ء کو منگلور، ضلع مانسہرہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ایبٹ آباد ہی میں حاصل کی۔ ۱۹۲۲ء میں منشی فاضل کیا اور ۱۹۲۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے فارسی زبان و ادب میں ایم.اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۲ء میں ایم.اے عربی کا امتحان اوّل درجے میں پاس کیا اور ۱۹۳۵ء میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۴۰ء میں حافظ محمود شیرانی کی سبک دوشی پر اورینٹل کالج میں اُردو کے لیکچرر مقرر ہوئے اور ۱۹۵۳ء میں اُردو کے پروفیسر ہوگئے۔ ۱۹۵۴ء میں اورینٹل کالج، لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے اور ۱۹۶۳ء میں اس عہدے سے سبک دوش ہوگئے۔ ۴/اگست ۱۹۸۶ء میں ان کی وفات ہوگئی۔ [۲۳] اُن کی اہم تصانیف ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، شعرائے اُردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن، بحث و نظر، ولی سے اقبال تک، اُردو ادب جنگِ عظیم کے بعد، سرسیّد اور ان کے نامور رفقا کی اُردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ ہیں۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے فارسی، اُردو اور عربی میں تحقیقی اور علمی خدمات سرانجام دیں۔ مختلف علوم کی گہری شناسائی ان کے تحقیقی نقطۂ نظر میں وسعت کا سبب بنی۔

دبستانِ لاہور کے دوسرے اہم محققین میں برج موہن، دتاتریہ کیفی، قاضی فضل حق، ڈاکٹر محمد باقر اور ڈاکٹر وحید قریشی قابلِ ذکر ہیں، ڈاکٹر وحید قریشی کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر سیّد عبداللہ اور مولوی محمد شفیع سے براہِ راست استفادہ کیا۔

ڈاکٹر وحید قریشی ۱۴/فروری ۱۹۲۵ء کو میانوالی میں پیدا ہوئے۔ پرائمری تعلیم مختلف مقامات سے حاصل کی۔ جہاں جہاں اُن کے والد محترم تعینات ہوئے وہاں وہاں سے اُن کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ میٹرک اسلامیہ ہائی سکول، بھاٹی گیٹ، لاہور اور بی.اے گورنمنٹ کالج، لاہور سے کیا۔ پھر ایم.اے فارسی اور ایم.اے تاریخ کے امتحانات پاس کیے۔ ۱۹۵۲ء میں پی ایچ.ڈی فارسی اور ۱۹۶۵ء میں ڈی لٹ اُردو کیا۔ اس کے بعد اسلامیہ کالج، گوجرانوالہ میں صدر شعبۂ تاریخ مقرر ہوئے۔ اسلامیہ کالج، لاہور میں لیکچرر تاریخ مقرر ہوئے اور بطور صدر شعبہ فارسی

خدمات انجام دیں۔ڈاکٹر وحید قریشی ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۰ء پنجاب یونیورسٹی، لاہور میں الفرید پٹیالہ ریسرچ سکالر رہے۔ ۱۹۵۱ء میں اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ، لاہور میں بطور لیکچرر شعبۂ تاریخ خدمات انجام دیں۔۱۹۶۳ء میں ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان کے سیکرٹری بنے اور ۱۹۶۴ء میں پاکستان رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔جنوری ۱۹۵۸ء تا دسمبر ۱۹۶۲ء اسلامیہ کالج، سول لائنز، لاہور میں فارسی کے لیکچرر اور صدرِ شعبہ رہے۔۱۹۸۲ء میں مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد میں ملازمت اختیار کی۔۱۹۸۷ء میں مقتدرہ سے سبک دوش ہوگئے۔**شبلی کی حیاتِ معاشقہ، میر حسن اور ان کا زمانہ، کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ** ان کے اہم تحقیقی کارنامے ہیں۔(۲۴) ڈاکٹر گوہر نوشاہی ڈاکٹر وحید قریشی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> اپنے پچیس سالہ تجربے کی بنا پر بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تحقیقی موضوعات پر ڈاکٹر وحید قریشی سے بہتر کسی استاد راہنما کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ برعظیم میں فنِ تحقیق کی اگر کسی روایت کو صحیح معنوں میں دبستان کہا جاسکتا ہے تو وہ دبستانِ لاہور ہے جو اپنے بعض امتیازی خصائص کے سبب مثالی اور زندہ جاوید ہے۔اور اگر میرا یہ مؤقف درست ہے تو اس میں یہ اضافہ بھی کروں گا کہ ڈاکٹر وحید قریشی کی ذات اور علمی شخصیت نہ صرف اس دبستان کی نمائندہ ہے بلکہ دبستانِ لاہور کی تربیت گاہ کے طور پر ان کی شخصیت مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ بلکہ اس روایت کا دور حاضر میں محور و مرکز بھی ہے۔اگر انھیں دبستانِ لاہور کی تربیت گاہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔(۲۵)

وزیر الحسن عابدی (متوفی ۱۹۷۹ء)، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر سہیل بخاری، سیّد عابد علی عابد (متوفی ۱۹۷۱ء)، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، محمد اکرام چغتائی اور ڈاکٹر تحسین فراقی اُردو تحقیق کے دبستانِ لاہور کے اہم نام ہیں۔ان کے علاوہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر جمیل جالبی، مشفق خواجہ، قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی، افسر صدیقی اور ڈاکٹر نجم الاسلام کو دبستانِ لاہور کے پیروکاروں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔چونکہ دبستانِ لاہور کے بنیادی خصائص ان کی تحقیق میں کسی نہ کسی حد تک موجود ہیں، ان بنیادی خصائص کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ مطبوعات پر مخطوطات کو ترجیح دی جاتی ہے۔
۲۔ ہر تحقیقی بیان کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ اگر کوئی بات تاریخی اعتبار سے غلط ہو تو اسے نظرِ ثانی کے قابل سمجھا جاتا ہے۔
۳۔ کوئی بیان حوالے اور ثبوت کے بغیر نہیں دیا جاتا۔
۴۔ حزم و احتیاط کا خاص خیال رکھا جاتا ہے تاکہ بیان کی صداقت میں کسی قسم کا کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

یہ چاروں خصوصیات ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر جمیل جالبی، مشفق خواجہ اور دیگر محققین کی تحقیق میں کسی نہ کسی حد تک پائی جاتی ہیں۔ اس لیے متذکرہ بالا اساتذۂ تحقیق کا شمار دبستانِ لاہور کے پیروکاروں میں کیا جانا چاہیے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں یکم جولائی ۱۹۱۲ء کو جبل پور (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ایم.اے فارسی، ایم.اے اُردو، ایل ایل بی، پی ایچ.ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ وہ ناگ پور یونیورسٹی، کراچی یونیورسٹی اور سندھ یونیورسٹی، جام شورو کے شعبۂ اُردو کے صدر رہ چکے ہیں۔ اُن کی اہم تصانیف حالی کا ذہنی ارتقا، علمی نقوش، فارسی پر اُردو کا اثر، ادبی جائزے، اقبال اور قرآن، اور معارف اقبال قابلِ تحسین ہیں۔ انھوں نے دیوانِ روشن کی تدوین بھی کی۔ وہ اُردو تحقیق کے دبستانِ لاہور میں بہت اہم مقام رکھتے ہیں۔ (۲۶)

ڈاکٹر جمیل جالبی یکم جولائی ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے یکے بعد دیگرے ایم.اے اُردو، ایل ایل بی، پی ایچ.ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ (۲۷) وہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد کے صدر نشین اور کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔ تحقیق و تنقید کے میدان میں انھوں نے کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ معاصر ادب، کلاسیکی ادب، تاریخ ادب ان کے اہم موضوعات ہیں۔ تحقیق کے حوالے سے تصحیحِ متون و لغات اور تراجم کے سلسلے میں ان کا کام نمایاں ہے۔ ان کی اہم تصانیف نئی تنقید، معاصر ادب محمد تقی میر، قلندر بخش جرأت، قدیم اُردو لغت، پاکستانی کلچر، قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ، تاریخ ادب اُردو جلد اوّل، جلد دوم، جلد سوم قابلِ تحسین ہیں۔ تصحیح متن کے حوالے سے مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، دیوانِ حسن شوقی، دیوان نصرتی وغیرہ خاصے کی چیزیں ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی تحقیق کا بہت معتبر نام ہے۔

اُردو تحقیق میں ایک اور اہم نام مشفق خواجہ کا ہے۔ مشفق خواجہ نقاد اور محقق ہیں۔ ۱۹/دسمبر ۱۹۳۵ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ اصل نام خواجہ عبدالحئی ہے، معروف قلمی نام مشفق خواجہ ہے۔ اس کے علاوہ کئی اور قلمی ناموں سے بھی جانے جاتے ہیں مثلاً ''خامہ بگوش'' طنزیہ مزاحیہ تحریروں کے لیے وقف ہے۔ انھوں نے ۱۹۵۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کیا۔ ۱۹۵۷ء میں جامعہ کراچی سے بی۔اے آنرز اور ۱۹۵۸ء میں ایم۔اے کا امتحان پاس کیا۔ تحقیق کا ذوق زمانۂ طالب علمی ہی سے تھا۔ میٹرک میں پنڈت دتاتریہ کیفی کی تحقیق کے حوالے سے کیفیہ پر ایک ایسا معیاری مقالہ لکھا جس نے اربابِ ذوق کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ ۱۹۵۷ء میں علامہ اقبال کی پہلی نثری کتاب الاقتصاد پر ایک تحقیقی وتنقیدی نوعیت کا مقالہ لکھا اور اسی سال انجمن ترقی اُردو سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۷۳ء تک اسی انجمن سے وابستہ رہے۔ انھوں نے اپنا ذاتی اشاعتی ادارہ ''مکتبہ اُسلوب'' کے نام سے قائم کیا اور اسی ادارے سے ماہنامہ اُسلوب جاری کیا، مکتبہ اُسلوب سے دوسرے ادیبوں کی تصانیف کے علاوہ اپنی تحقیقات بھی شائع کیں۔ اُن کی تحقیقی خدمات قابلِ تحسین ہیں۔ انھوں نے دبستانِ لاہور کے تحقیقی اصول وضوابط کی پاسداری کی۔ (۲۸)

ان بزرگ محققین کی تربیت کا ثمر ہے کہ دبستانِ لاہور آج بھی اپنی جملہ خوبیوں کے ساتھ تحقیق کے میدان میں اپنے فرائض انجام دے رہا ہے۔ دبستانِ لاہور تا حال اپنی تحقیقی روایات قائم رکھے ہوئے ہے۔ اِن بزرگ محققین کی تربیت یافتہ نسل آج تک دبستانِ لاہور کے فروغ میں بدستور اپنی خدمات پیش کر رہی ہے۔ اِن محققین میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری، محمد اکرام چغتائی، ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر صدیق جاوید، خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر گوہر نوشاہی اور تحسین فراقی کے نام بہت اہم ہیں۔ دبستانِ لاہور کی تحقیقی روایت کو آگے بڑھانے میں افراد اور شخصیات کے علاوہ بعض اداروں کا کردار بھی بہت اہم ہے۔ اِن میں ادارہ تحقیقاتِ پاکستان؛ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور؛ مرکزی اُردو بورڈ؛ مجلس ترقی ادب اور انجمن ترقی اُردو قابلِ ذکر ہیں۔ اِن اداروں کے علاوہ جامعہ پنجاب کا شعبہ تصنیف وتالیف اُردو دائرہ معارف اسلامیہ اور اورینٹل کالج میگزین بہت اہم تحقیقی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں درج ذیل چند اداروں کی خدمات کا مختصر تذکرہ ضروری ہے۔

مجلس ترقی ادب سے وابستہ محققین میں سیّد عابد علی عابد، کلب علی فائق، خلیل الرحمٰن

داؤدی، مرتضیٰ حسین، فاضل لکھنوی اور ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے نام اہم ہیں۔ سیّد عابد علی عابد مجلس سے نکلنے والے مجلّے **صحیفہ** کے مدیر تھے۔ انھوں نے **صحیفہ** کے ذریعے اہم تحقیقی خدمات انجام دیں اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔ **صحیفہ** کے علاوہ انھوں نے مجلس کے لیے جو کام کیا اِس میں ان کی معروف تصانیف میں اُسلوب اور البیان شامل ہیں۔ خلیل الرحمٰن داؤدی نے بہت سے کلاسیکی متون کی تدوین کی جن میں **مذہبِ عشق**، **سروشِ سخن**، **قصہ اگر گل** وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

گوہر نوشاہی اور کلب علی خاں فائق رام پوری نے مجلس کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں جن میں **پدماوت** اور **یادگارِ چشتی** مرتبہ گوہر نوشاہی اور **کلیاتِ میر** مرتبہ کلب علی خاں فائق رام پوری وغیرہ اہم ہیں۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کا مرتبہ **کلیات سودا** بھی مجلس سے شائع ہوا۔ مجلس ترقی ادب ایک ادارہ ہی نہیں، اسے اُردو تحقیق کی ایک تربیت گاہ کی حیثیت حاصل ہے۔ بے شمار محققین کے تحقیقی کارنامے اس ادارے کی وساطت سے منظرِ عام پر آئے۔ سیّد امتیاز علی تاج نے کلاسیکی ڈرامے یہیں سے مرتب کیے۔

اس کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی کی خدمات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جامعہ پنجاب کا شعبہ تصنیف و تالیف بہت اہم خدمات انجام دے رہا ہے۔ جامعہ پنجاب کا مبسوط منصوبہ اور دائرہ معارف اسلامیہ بھی اہم کام کرنے میں مصروف ہے۔ کتب خانہ پنجاب کے مخطوطات کی فہرستیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کتب خانے کے دیگر ذخائر ذخیرۂ شیرانی اور ذخیرہ مولوی محمد شفیع کی فہرستیں بھی شائع ہوگئی ہیں۔ اس طرح ادارہ تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک وہند کی خدمات سے بھی صَرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔ اس ادارے نے بلند پایہ محققین کی تحقیقات شائع کیں جن میں فضل الدین قریشی، سخاوت مرزا، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر لائٹنر، آغا محمد باقر، سیّد وزیر الحسن عابدی، ڈاکٹر محمد باقر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

مجموعی طور پر ۱۹۵۷ء سے پاکستان میں تحقیق پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ ۱۹۵۷ء سے علمی و تحقیقی اداروں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد جتنے بھی تعلیمی کمیشن قائم ہوئے ان سب نے تحقیق پر زور دیا۔ اور اب تو پاکستان کی تمام یونیورسٹیاں تحقیق کے میدان میں سرگرمِ عمل نظر آتی ہیں۔

دوسرا باب

ڈاکٹر گوہر نوشاہی، سوانح اور شخصیت

خاندانی پس منظر

۱۹۶۵ء کے بعد میدانِ تحقیق میں جو لوگ ابھر کر سامنے آئے ان میں ایک نام ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا بھی ہے۔ والدین نے نام فضلِ میراں رکھا۔ ادبی دنیا انھیں ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے نام سے جانتی ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی شرق پور (ضلع شیخوپورہ) میں پیدا ہوئے۔ شرق پور لاہور سے بیس کلومیٹر کے فاصلے پر جڑاں والا روڈ پر واقع ہے، جس کی بنیاد مغلیہ دور کے آخری زمانے میں رکھی گئی۔ یہ علاقہ خوب صورت، سرسبز اور زرخیز ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی دادی اماں کے تعلق سے شرق پور کے بانی بزرگوں کی اولاد میں سے ہیں۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا خاندان قصور سے آکر شرق پور کے نواح میں آباد ہوا تھا۔ اس خاندان کا آبائی شجرہ حافظ محمد حسین سے ملتا ہے جو قصور کے اکابر علما میں سے تھے۔ اس خاندان کے سب سے قدیم بزرگ جن کا حوالہ قصور کے بزرگوں کے پاس محفوظ بعض دستاویزات سے ملتا ہے، وہ حافظ محمد حسین ہی تھے۔ قصور کے قاضی خاندان سے ایک دستاویز ڈاکٹر صاحب کے والد کو ملی جس پر حافظ محمد حسین کی گواہی تھی۔ اور حافظ صاحب کے نام کے ساتھ وہ تمام القابات درج تھے جو مغلیہ دور میں یا اس کے بعد مسلمان علما کے لیے مخصوص تھے۔ [1] حافظ محمد حسین کے پانچ بیٹے ہوئے۔ ان نام یہ ہیں؛ حافظ شعبان، حافظ سلیمان، حافظ سلطان، حافظ برہان الدین اور عبدالخالق۔ عبدالخالق لاولد تھے۔ باقی چار بھائیوں میں سے دو بھائی، حافظ محمد شعبان اور حافظ محمد سلطان، قصور میں رہے۔ حافظ محمد سلیمان اور حافظ برہان الدین تلاشِ معاش میں قصور کو ترک کر کے شرق پور آگئے اور اس شہر سے چند میل دور ایک گاؤں ڈھول پور میں سکونت اختیار کی۔ [2] ان کے

مزارات ابھی تک اسی گاؤں میں موجود ہیں۔

حافظ محمد سلیمان کی اولاد میں سے ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا ددھیالی اور حافظ برہان الدین کی اولاد سے ان کا ننھیالی خاندان ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے دادا میاں غلام رسول ولد میاں علی محمد ولد میاں محمد عثمان، حافظ سلیمان کی اولاد سے ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر صاحب کے نانا میاں دل محمد ولد میاں شیر محمد ولد میاں پیر بخش، حافظ برہان الدین کی اولاد سے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے دادا کے چار بیٹے اور ایک بیٹی زندہ رہے۔ بیٹوں کے نام بالترتیب مولانا محمد حیات، میاں غلام محی الدین، میاں غلام یٰسین اور میاں محمد عالم تھے اور بیٹی کا نام ہاجرہ بی بی تھا۔ (۳) ڈاکٹر صاحب کی دادی امیر النسا اکابرینِ شرق پور میں سے میاں محمد الدین کی بیٹی تھی۔ جو شرق پور کے بانی علما کی اولاد ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی ممتاز روحانی شخصیت بھی تھے۔ (۴)

میاں محمد الدین کی کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی اس لیے ان کی بڑی صاحبزادی امیر النسا کی اولاد اُن کی جانشین اور وارث قرار پائی۔ محترمہ امیر النسا کی والدہ محترمہ اور میاں محمد دین کی اہلیہ بی بی سائرہ میاں ہرنی شاہ کے خاندان سے تھیں جو شرق پور کا قدیم ترین اور رُوحانی خاندان ہے۔ میاں ہرنی شاہ اور ان کے والد حضرت شاہ مراد کے مزار محلہ حضرت ہرنی شاہ میں واقع ہیں۔ (۵) اس گدی کے سجادہ نشین میاں نور محمد نصرت نوشاہی حضرت میاں نیک محمد نوشاہی کے فرزند ہیں۔ مختلف علوم وفنون پر دسترس رکھتے ہیں۔ انھوں نے عربی اُردو اور فارسی میں، ایم۔اے، ایم۔او۔ایل کی ڈگریاں حاصل کر رکھی ہیں۔ اس وقت شرق پور کی ممتاز علمی شخصیات میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اس خاندان کی ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے خاندان سے قریبی رشتہ داریاں اور احترام کے رشتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے والد مولانا محمد حیات اپنے والد کی سب سے بڑی اولاد اور اپنے نانا میاں محمد الدینؒ کے فیض یافتہ اور مرید تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے سجادہ نشین مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کے دادا میاں غلام رسول پیشے کے اعتبار سے کسان تھے۔ (۶) انھیں زمین سے محبت اور زمین پر بسنے والوں سے تعلق اللہ تعالیٰ نے فطرت میں دیا تھا۔ میاں غلام رسول علوم متداولہ کی معمولی استعداد رکھتے تھے۔ تاہم بقدر ضرورت دینی تعلیم حاصل کر لی تھی۔ وہ نہایت نیک خصلت اور پاکیزہ سیرت انسان تھے۔ ان کے والد میاں علی محمد البتہ پڑھے لکھے تھے۔ (۷) میاں علی محمد کے چچازاد بھائی میاں پیر بخش پنجابی زبان کے شاعر تھے۔ ان کی سی حرفیاں خاصی مشہور ہیں۔

اکثر قوال حال و قال کی محفلوں میں اب بھی ان کا کلام گاتے ہیں۔ خاص طور پر ان کی ایک کافی جس کے بول ہیں: "گھونگٹ کھول، جمال پیا دے"۔ (۸)

میاں پیر بخش کے پوتے میاں دل محمد، رشتہ میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے نانا تھے۔ وہ بھی پنجابی زبان کے شاعر تھے۔ سی حرفی ان کا خاص میدان تھا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے ننھیالی خاندان میں ان کے ماموں حکیم میاں محمد حسین نہ صرف ایک طبیب تھے بلکہ علمِ نبض شناسی پر انھیں خصوصی دسترس تھی۔ انھوں نے علمِ نبض شناسی پر ایک مسودہ بھی چھوڑا ہے جو ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے کتب خانے میں موجود ہے۔

میاں محمد حسین کے ایک بیٹا اور ایک بیٹی موجود ہیں۔ بیٹے کا نام محمد یوسف ہے جو لاہور کے نزدیک ایک گاؤں شاہ پور کانجرہ میں رہتے ہیں۔ میاں محمد یوسف نہایت ملنسار اور خلیق انسان ہیں۔ اس خاندان کی شہرت اور مقبولیت حفظِ قرآن سے وابستہ ہے۔ میاں محمد یوسف کے ایک بیٹے نے قرآن مجید حفظ کر کے اس روایت کو برقرار رکھا ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے والد محترم مولانا محمد حیات نوشاہی ایک روحانی شخصیت تھے۔

موصوف کے بارے میں صاحبزادہ نصرت نوشاہی لکھتے ہیں:

> بلند پایہ علمی اور روحانی شخصیات میں حضرت میاں محمد حیات صاحب اپنے جامع کمالات اور روشن اوصاف کی بنا پر اپنی مثال آپ تھے۔ دینی اقدار سے مزین آپ کی عہد آفرین شخصیت شریعت اور طریقت کے حلقوں میں محتاجِ تعارف نہ تھی۔ تاریخ ادب وانشا اور علم و تحقیق میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ (۹)

مولانا محمد حیات نوشاہی ۱۹۰۰ء میں شرق پور میں پیدا ہوئے۔ (۱۰) قرآن پاک کی تعلیم مولانا محمد شفیعؒ اور مولانا فتح محمدؒ سے حاصل کی اور شرق پور کے سکول سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ نامور عالمِ دین حضرت خواجہ نور الحسن تارک اویسیؒ کے مدرسہ سے دینی تعلیم کی ابتدا ہوئی۔ تقریباً نو (۹) سال ان کی خدمت میں گزارے اور پھر واپس آ گئے۔ مزید دینی تعلیم کے حصول کے لیے ۱۳۴۰ھ میں مدرسہ نعمانیہ، لاہور میں داخل ہو گئے۔ (۱۱) یہاں سے دستارِ فضیلت حاصل کی۔ ۱۹۶۰ء تک اسی مدرسہ سے وابستہ رہے۔ آپ بڑے عالی ظرف اور پختہ مزاج انسان تھے۔ بالغ نظری، مہمان نوازی، درویشی اور بے باکی آپ کی شخصیت کی نمایاں خوبیاں تھیں۔ آپ دینی

معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ رکھتے تھے۔

جب آپ لوگوں کو گراں قدر علمی معلومات فراہم کرتے تو وہ آپ کی یادداشت اور ذہانت پر دنگ رہ جاتے۔ مولانا محمد حیات نوشاہی صحیح معنوں میں اپنے آباواجداد کے علمی اور روحانی ورثہ کے امین تھے۔ نصرت نوشاہی لکھتے ہیں:

> مشائخ اسلام کے تبلیغی، اصلاحی اور فکری و فنی موضوعات پر آپ کی گفتگو بڑی مدلّل اور خیال افروز ہوتی تھی۔ تقریر سادہ الفاظ میں بڑی مؤثر اور عام فہم انداز میں کرتے۔ جس میں فروعی اور اختلافی مسائل کی بجائے توحید و تصوف، عظمت رسالت، شانِ فقر، اخلاقیات، عبادات و اذکار اور محبتِ الٰہی کا ذکر ہوتا تھا۔ کلام میں سوز د گداز اور جوش و جذبہ کا اثر پایا جاتا تھا۔ تعلیم و تدریس میں آپ کی مہارت مثالی تھی۔ (۱۲)

مولانا محمد حیات نوشاہی کو عربی اور فارسی پر عبور حاصل تھا۔ انھیں اُردو، فارسی، عربی اور پنجابی شعرا کے بے شمار اشعار زبانی یاد تھے۔ گفتگو میں فصاحت و بلاغت ایسی تھی کہ سننے والا لطف اندوز ہوتا تھا۔ آپ کا شمار تحریکِ پاکستان کے کارکن علما میں ہوتا تھا۔ (۱۳) تاریخ سے مولانا محمد حیات نوشاہی کو گہرا شغف تھا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی تحقیقی لگن اور صلاحیتوں کو سنوارنے نکھارنے میں ان کے والد محترم کا ذوق بھی شامل ہے۔ مولانا کی اہم تصنیف **گلزار نوشاہی** ہے جس کی وجہ سے انھیں خاندان نوشاہی میں کافی شہرت ملی۔ **گلزار نوشاہی** سلسلہ نوشاہیہ کے بزرگوں کا تذکرہ ہے۔ اس سلسلے کے بزرگوں کی غالباً پہلی مطبوعہ کتاب **گلزار نوشاہی** ہے۔

گلزار نوشاہی ۱۹۳۴ء میں اسلامیہ پریس، لاہور سے چھپی اور مصنف نے اسے شرق پور سے شائع کیا۔ مولانا کو اِس تصنیف میں حضرت شریف احمد شرافت نوشاہی مصنف **شریف التواریخ** کا خاص تعاون حاصل رہا۔ **گلزار نوشاہی** میں سلسلہ نوشاہیہ کے بانی حضرت حاجی محمد نوشہ گنج بخشؒ کے سوانح اور ان کے مریدین اور اس سلسلے سے تعلق رکھنے والے بزرگوں کے حالاتِ زندگی درج ہیں۔ حضرت نوشہ گنج بخشؒ کے تفصیلی حالات کے بعد آپ کے خلیفہ اعظم حضرت پیر محمد سچیارؒ کے حالات قلم بند ہیں اور ساتھ ہی ان کے مریدین کا ذکر ہے۔

مولانا محمد حیات نوشاہی کو حضرت پیر محمد سچیارؒ سے بہت ارادت تھی۔ سوتے جاگتے، چلتے

پھرتے، اٹھتے بیٹھتے حضرت پیر محمد سچیار کا نام اُن کے لبوں پر رہتا تھا۔(۱۴) گلزار نوشاہی میں حضرت پیر محمد سچیار کے حالات انھوں نے بڑی عقیدت سے قلم بند کیے ہیں۔ حضرت شاہ مراد شرق پوری کے سلسلے میں مصنف کے مرشد حضرت میاں محمد الدین نوشاہی شرق پوری کے تفصیلی حالات بیان کیے گئے ہیں۔ مولانا محمد حیات نوشاہی، جیسے پہلے بیان ہوا، حضرت میاں محمد الدین نوشاہی کے نواسے اور مرید تھے۔ کبھی کوئی کام اپنے مرشد کی مرضی کے خلاف نہیں کرتے تھے۔ مرشد یعنی نانا کی وفات کے بعد آپ ہی ان کے سجادہ نشین ہوئے۔ حضرت میاں محمد الدین کا مزار دربار شریف حجرے والا، شرق پور میں ہے۔ مولانا محمد حیات نوشاہی نے ۱۹۷۴ء میں حرمین شریف کی زیارت کی اور سعادت حج سے بہرہ مند ہوئے۔ انھیں حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی سے بھی روحانی فیض حاصل کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ پیر مہر علی شاہ صاحب نے انھیں سورۃ الحمد کی اجازت دی اور اس کے مخفی اسرار سمجھائے۔ انھیں بزرگوں کے آستانوں پر جانے کا بہت اشتیاق تھا۔ انھیں حضرت شاہ گل حسن قادریؒ خلیفہ مجاز حضرت غوث علی شاہ صاحب قلندر پانی پتیؒ اور حضرت اثر جالندھریؒ سے خصوصی ملاقاتوں کا شرف حاصل ہوا۔ انھوں نے تصوف کی ترویج کے لیے لاہور سے ماہنامہ نوشاہی کا اجرا بھی کیا۔(۱۵)

مولانا محمد حیات نوشاہی مدرسہ نعمانیہ میں اپنی تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد شرق پور میں عربی علوم کا ایک مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن بوجوہ ایسا نہ کرسکے۔ ان کے مرشد نے انھیں روحانیت کی تبلیغ کے لیے ہدایت کی اس طرح وہ مدرسے کے مشغلے کو مستقل طور پر نہ اپنا سکے البتہ پوری زندگی درویشانہ انداز میں روحانیت کی تبلیغ میں گزار دی۔ مولانا کی دو اور اہم کتابیں اوراد نوشاہی اور چہل ارشادات حضرت پیر محمد سچیار نوشہرویؒ خاصے کی چیزیں ہیں۔ اوراد نوشاہی میں سلسلہ نوشاہیہ کے بزرگوں کے وظائف درج ہیں۔ اِن کے علاوہ اس میں اُن اجازتوں کا بھی ذکر ہے جو مولانا کو اپنے مرشد حضرت میاں محمد الدین نوشاہی سے عطا ہوئیں۔ ان اوراد میں درود ہزارہ، دعائے عکاشہ، اسمِ اعظم غوثیہ، یازدہ اسمائے غوثیہ، ہفت کافی، وظائف پنجگانہ، وظیفہ نمازِ تہجد، شجرہ طریقت سلسلہ قادریہ نوشاہیہ، دعائے اختتام حضرت فقیر کامل میاں محمد دین نوشاہی سے منسوب پنجابی اشعار، مدح نوشاہیہ اور طریقہ خلوت اور محل عجابت کے بارے میں مؤلف یعنی مولانا محمد حیات نوشاہی سے استفادے کی اجازت وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

چہل ارشادات حضرت پیر محمد سچیار نوشہروی میں حضرت محمد ہاشم تھرپالوی کی کتاب چہار بہار کے مطالب کا خلاصہ کیا گیا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ مولانا کے متعدد مخطوطات موجود ہیں۔ ان مخطوطات میں ایک مکمل کتاب اذکار الصالحین ہے جس میں بزرگانِ شرق پور کے حالات درج ہیں، بطور خاص اِن کے ننھیالی خاندان سے تعلق رکھنے والے بزرگوں کے حالات اس میں شامل ہیں۔ ان کے ننھیالی بزرگوں کا تعلق حجرہ شاہ مقیم سے تھا۔ ان کی والدہ کے خاندان کے بڑے بزرگ حافظ محمد اسماعیل عشر قاری حجرہ شاہ مقیم ہی سے شرق پور آئے تھے۔ ان کے کتب خانے کی کچھ قلمی کتابیں ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے پاس موجود ہیں۔ ایک کتاب طبِ شہابی تھی جو چوری ہو گئی۔

مولانا محمد حیات نوشاہی نے تحریک پاکستان کے لیے بھی کام کیا۔ وہ قائداعظم کے تائیدی علما میں شامل تھے۔ شرق پور کی چار شخصیات ایسی تھیں جنھیں قائداعظم کے افکار اور نظریات سے بے پناہ محبت تھی۔ ان میں سے ایک مولانا محمد حیات نوشاہی دوسرے حضرت میاں شیر محمدؒ کے چھوٹے بھائی حضرت میاں غلام اللہ، جنھیں ثانی صاحب بھی کہا جاتا ہے، اور تیسرے ملک حسن علی جامعی جامعہ ملیہ کے گریجویٹ تھے، حکیم طبیب اور اہلِ علم انسان تھے جن کے بڑے صاحبزادے ذوالفقار علی ملک بہاول پور یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے ہیں اور چھوٹے صاحبزادے محمود علی ملک پاکستان کے ممتاز ماہر قلب ہیں۔ چوتھی شخصیت، ظہیر نیاز بیگی کی ہے۔ یہ تحریک پاکستان کے اہم کارکن تھے۔ تحریک پاکستان کے حوالے سے ظہیر بیگی کی نظمیں مثلاً "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ"، "یہ جھنڈا یہ قومی حمیت کا جھنڈا" وغیرہ معروف ہوئیں۔ (۱۶)

قیامِ پاکستان کے وقت جب مہاجرین کے لٹے پٹے مفلوک الحال اور آزردہ خاندان پاکستان کے مختلف شہروں میں داخل ہوئے تو ان کی ایک بڑی تعداد شرق پور میں بھی وارد ہوئی۔ ان مہاجرین کی آبادکاری یعنی انھیں مکان اور دکانیں وغیرہ الاٹ کرنے کے لیے جو کمیٹی شرق پور میں قائم ہوئی، مولانا محمد حیات اس کے سربراہ تھے۔ (۱۷)

شرق پور ایک اہم تجارتی قصبہ تھا۔ ہندو مہاجنوں کی اور تاجر پیشہ حضرات کی یہاں کثرت تھی۔ دور دور تک اس قصبے کو ثروت مند ہونے کے طور پر جانا جاتا تھا۔ چنانچہ نقل مکانی کرنے والے ہندوؤں کے گھروں سے بھاری مقدار میں مال و اسباب، زر و دولت وغیرہ جمع ہوا جسے شہر کے درمیان واقع پولیس چوکی میں رکھا گیا۔

مولانا محمد حیات نوشاہی اور ان کے ساتھی اکابرین نے اس مالِ غنیمت کا جس دیانت داری سے انتظام کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ سونے چاندی کے زیورات کے ڈبے ہندوؤں کے گھروں سے نکال کر لائے گئے۔ مولانا کی نگرانی کا کمال یہ تھا کہ ایک پیسہ ناجائز کسی کے ہاتھ نہیں آیا۔ [۱۸] ایک واقعہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی اپنی یادداشت سے بیان کرتے ہیں کہ شرق پور میں ایک ساہوکار آیا رام نام کا رہتا تھا جو اپنی امارت اور شان وشوکت کو ظاہر کرنے کے لیے یورپ سے منگوائی ہوئی خالص سونے کی گھڑی اور اس کے ساتھ خالص سونے کی چین پہنتا تھا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے بڑے بھائی حاجی خادم میراں نوشاہی گلی سے گزر رہے تھے کہ آیا رام، جسے لوگوں نے اپنی طرف سے قتل کر دیا تھا، زخمی حالت میں تڑپ رہا تھا۔ آیا رام نے نقاہت آمیز آواز سے کہا ''خادم! میری گھڑی اتار لو''۔ آیا رام مولانا محمد حیات نوشاہی کے قریبی دوستوں میں سے تھے اور خادم میراں صاحب ان سے بے حد مانوس تھے۔ اسی تعلق کی بنا پر وہ آگے بڑھے اور سونے کی گھڑی اتارنے کی کوشش کی۔ اتنے میں پیچھے سے چند لوگ للکارتے ہوئے آئے، خادم! آگے نہ بڑھنا۔ خادم میراں صاحب یہ آواز سن کر بے ہوش ہو گئے اور لوگوں نے سونے کی گھڑی اتار لی اور خادم میراں صاحب کو گھڑی سمیت واپس لے آئے اور مولانا محمد حیات سے کہا کہ آیا رام مرنے سے پہلے یہ سونے کی گھڑی خادم میراں کو دے رہا تھا، یہ اب ان کی ہے، آپ لے لیں۔ ہم نے بچے کو اس لیے للکارا کہ کہیں آیا رام دشمنی میں اس پر وار نہ کر دے۔ مولانا محمد حیات نے اس بیش قیمت گھڑی کو اسی وقت لا کر مالِ غنیمت میں جمع کروا دیا اور لوگوں کے اصرار کے باوجود اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح مالِ غنیمت کے کئی نوادر مولانا کو پیش کیے گئے لیکن انھوں نے ان پر اپنا استحقاق نہ سمجھا۔

مولانا محمد حیات نوشاہی کے تین بھائی تھے: میاں غلام محی الدین، میاں غلام یٰسین اور محمد عالم۔ میاں غلام محی الدین ہیڈ ماسٹر ریٹائر ہوئے۔ انھوں نے نوے برس کی عمر میں وفات پائی۔ ان کے چھ بیٹے اور ایک بیٹی موجود ہیں۔ بیٹوں کے نام بالترتیب محمد حمید نوشاہی، محمد جاوید نوشاہی، محمد افضل نوشاہی، محمد سلیم نوشاہی، محمد شکیل نوشاہی اور محمد سہیل نوشاہی ہیں۔ بیٹی کا نام منیر فاطمہ ہے۔ ان بچوں کی اولاد موجود ہے۔ محمد حمید امریکہ میں مقیم ہیں۔ ان کا ایک بیٹا محمد فراز اور دو بیٹیاں ہیں۔ محمد جاوید اور ان کے چھوٹے دوسرے بھائی پاکستان میں ہیں۔ [۱۹] محمد جاوید کے ایک بیٹا

اور ایک بیٹی ہے۔ بیٹا محمد جمال امریکہ میں زیرِ تعلیم ہے۔ سب بھائی پڑھے لکھے اور صاحب علم و دانش ہیں۔ دوسرے بھائی میاں غلام یٰسین تھے جن کے چھ بیٹے: غلام غوث، غلام صمدانی، محمد سلیم، محمد متین، محمد ناصر، محمد سجاد اور چار بیٹیاں ہوئیں۔ تیسرے بھائی میاں محمد عالم تھے جن کے یہاں چار بیٹے: غلام مصطفیٰ، غلام مرتضیٰ، مختار احمد اور محمد فیاض پیدا ہوئے۔ میاں محمد عالم اپنے والد کی روایت کے مطابق کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے۔ بھائیوں کی اور اپنی زمینوں کا انتظام انھی کے ہاتھ میں تھا۔ میاں غلام یاسین اور محمد عالم دونوں فوت ہو چکے ہیں۔ میاں محمد عالم کے صاحبزادوں میں میاں غلام مصطفیٰ فوت ہو چکے ہیں۔ میاں محمد عالم کی اولاد شرق پور ہی میں مقیم ہے اور اپنی آبائی زمینوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ محمد عالم چونکہ کسان تھے اس لیے ان کے سارے بچے تعلیمی اعتبار سے کوئی نمایاں جگہ تو نہ حاصل کر سکے لیکن شرق پور میں ان کی عزت و احترام موجود ہے۔ (۲۰)

مولانا محمد حیات نوشاہی نے ہر قدم پر تحریک پاکستان کا ساتھ دیا اور قائداعظم کے نظریات سے محبت کی۔ جب قائداعظم کی وفات ہوئی تو غائبانہ نماز جنازہ کی غرض سے میاں شیر محمد صاحب کے بنوائے ہوئے وسیع و عریض چھپر کے نیچے ہزاروں نفوس اکٹھے ہوئے۔ مولانا محمد حیات نے سب سے پہلے میاں غلام اللہ صاحب کو نماز جنازہ پڑھانے کو کہا لیکن میاں غلام اللہ اور دیگر عمائدین نے متفقہ طور پر مولانا محمد حیات کا انتخاب کیا۔ انھوں نے قائداعظم کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی۔ (۲۱)

مولانا محمد حیات نوشاہی بنیادی طور پر عالمِ دین تھے۔ (۲۲) وہ قرآن مجید کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے۔ مولانا محمد حیات کا شمار مولانا غلام مرشد کے چہیتے شاگردوں میں ہوتا تھا۔ مولانا غلام مرشد تحریک پاکستان کے کارکن، شاہی مسجد کے امام اور مدرسہ نعمانیہ، لاہور کے صدر معلم تھے۔ مولانا غلام مرشد کا شمار عقلیت پسند علما میں ہوتا تھا۔ ان کی یہی فکر اُن کے شاگردوں میں آئی۔ مولانا محمد حیات سیاست، طب اور روحانیت میں دلچسپی رکھتے تھے لیکن ان کی شخصیت کا نمایاں پہلو روحانیت ہے۔ درویشی کا یہ عالم تھا کہ کسی سے نذر نیاز نہ لیتے تھے۔ جو ملتا لوگوں میں تقسیم کر دیتے۔ وہ کہتے کہ اللہ بندوں کے ذریعے جو مجھے بھیجتا ہے اُسے شام سے پہلے خرچ ہونا چاہیے۔ (۲۳) انھوں نے اپنی ساری زندگی اسی اصول پر گزار دی۔ مولانا محمد حیات نوشاہی ۲۴ر جولائی ۱۹۸۳ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ان کے جسد خاکی کو ان کے آبائی قبرستان

شرق پور شریف کے مشہور دربار حجرے والا کی مسجد کے حجرے میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے ان کی وفات پر قطعہ تاریخ بھی موزوں کیا ہے جو ذیل میں درج ہے:

چوں زبزم وجود کرد سفر　　آں محمد حیات عالی جاہ

عالم و واعظ و فقیہہ و فقیر　　آں رموز آشنائے الا اللہ

عارف و واقفِ خفی و جلی　　ہادی و رہنمائے ہر گمراہ

حاجیِ کعبہ، زائرِ حرمین　　عاشقِ روضۂ رسول اللہؐ

''مرغ اہلِ بہشت'' شد تاریخ　　ہاتفے گفت در دلم، ناگاہ

۱۹۸۳ء

سالِ ہجری ازش چو جستم گفت　　''تاج بخشِ زمن'' بلند نگاہ (۲۴)

۱۴۰۳ھ

مولانا محمد حیات نوشاہی نے وفات سے چھ سال قبل اپنی جائیداد ایک وصیت نامے کے ذریعے اپنی اولاد میں تقسیم کی اور وصیت نامے کو ۲۲ راگست ۱۹۷۷ء کو جاری کیا، جس کی نقل میرے سامنے ہے۔ اس وصیت نامے کی عبارت درج ذیل ہے:

وصیت نامہ

''منکہ الحاج محمد حیات ولد حاجی غلام رسول نوشاہی شرق پوری حال مکان نمبر A / 39 سانده روڈ عثمان پارک لاہور کا ہوں۔ یہ کہ میرے وارثان بازگشت میں سے صرف دولڑکے مسمیان خادم میراں نوشاہی نمبر ۲ فضلِ میراں گوہر نوشاہی اور تین لڑکیاں مسماۃ (۱) منور بی بی (۲) نسیم بی بی (۳) بلقیس بی بی ہیں۔ اس کے علاوہ میری اور کوئی اولادِ نرینہ یا دختر وغیرہ نہیں ہے۔ اور میری بیوی پیشتر ہی فوت ہو چکی ہے۔ جس کے مرنے کے بعد میں نے تاحال کوئی دوسری شادی نہیں کی ہے اور نہ ہی آئندہ کرنے کا ارادہ ہے۔ من واصی کی زرعی اراضی وسکنی مکان واقع شرق پور تحصیل فیروز والا ضلع شیخوپورہ موجود ہیں۔ میری اراضی موضع مذکور تین چاہات الموسومہ چاہ رگو والہ، چاہ حجرے والہ اور چاہ کھوتیوں والہ میں تقریباً ۱۵ کنال ہے۔ اور دو مکانات ہیں۔ ایک مکان خسرہ نمبر 932 چاہ رگو والہ اور ایک

مکان سالم میری ملکیت ہے اور دوسرا جدی مکان اندرون شہر شرق پور جس میں واصی 1/4 حصے کا مالک ہے۔ علاوہ ازیں میرا ایک مکان واقع 39/A سانده روڈ کرشن نگر لاہور بھی ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ میں واصی اپنی زندگی میں اس جائیداد کو حق داران میں بذریعہ وصیت نامہ ہذا تقسیم کر دوں تا کہ میرے مرنے کے بعد وارثان میں تقسیم جائیداد کے سلسلے میں شکر رنجی پیدا ہو کر عدالتی اخراجات سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ لہٰذا من واصی بلا اجبار و اکراہ دیگرے با قائمی ہوش وحواس و بہ اثباتِ عقل و خرد اراضی موضع شرق پور واقع چاہ رگووالہ خسرہ نمبر 946 میں سے رقبہ مقداری ایک کنال چار مرلے ہر سہ دختران خود بہ حصہ مساوی دیتا ہوں۔ اور اگر لڑکیاں چاہیں تو اراضی کے متبادل اپنے بھائیوں سے نقد رقم مبلغ تین ہزار روپے لے سکتی ہیں۔ بقایا رقبہ واقع شرق پور میرے ہر دو پسران مذکور برابر کے حق دار ہوں گے۔ اور ہمارا جو جدی مکان واقع شرق پور مذکور ہے جس میں من واصی 1/4 حصے کا مالک ہوں وہ من واصی اپنی اولاد کے نام وقف کرتا ہوں جو آئندہ وقفِ اولاد کہلائے گا۔ اور کسی بھی صورت کو اس کے انتقال و ابدال، رہن، ہبہ، بیع وغیرہ کا حق و اختیار حاصل نہ ہوگا۔ اسی طرح خسرہ نمبر 825 رقبہ ایک کنال پانچ مرلہ واقع چاہ رگووالہ گوہر (نوشاہی) فضلِ میراں پسرِ مذکور میرے چلے جانے کے بعد حق دار ہوگا۔ اور اسی طرح خسرہ نمبر 945 رقبہ تعدادا ایک کنال پانچ مرلے میرے بعد خادم میراں لینے کا حق دار ہوگا۔ اور خسرہ نمبر 946 میں بارہ مرلے اراضی دونوں پسران برابر کے لینے کے حق دار ہوں گے۔ بقایا اراضی میں ہر دو پسران برابر کے حق دار تصور ہوں گے۔ وہ آپس میں مل کر میرے مرنے کے بعد جس طرح چاہیں اس کا فیصلہ کر لیں۔ مکان نمبر 39/A واقع سانده روڈ کشن نگر لاہور کا جنوبی حصہ خادم میراں اور شمالی حصہ فضلِ میراں میرے مرنے کے بعد لینے کے حق دار ہوں گے۔ لہٰذا وصیت نامہ ہذا بہ مرضی اور رغبت خود تحریر کر دیا ہے۔ جس کو سند سمجھ کر درست تسلیم کرتا ہوں تا کہ سند رہے۔ تحریر ۲۲ راگست ۱۹۷۷ء (۶ ررمضان المبارک ۱۳۹۷ھ)۔

نوٹ: چاہ حجرہ والہ پر خسرہ نمبر 916 ایک آم کے 1/4 حصے کا مالک ہوں وہ تینوں میری لڑکیاں برابر کی مالک ہوں گی۔ (دستخط)

العبد

الحاج محمد حیات واصی

حاجی محمد حیات نوشاہی بقلم خود

22/08/1977

(وصیت نامہ مملوکہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی)

[اس وصیت نامے میں لڑکیوں کے نام مولانا سے سہواً غلط ہو گئے ہیں۔ بڑی بیٹی کا نام منور تاج تھا اور چھوٹی کا نام نسیم اختر ہے۔]

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی والدہ محترمہ رحیم بی بی نیک سیرت اور سادہ طبیعت خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنے خاوند کے علمی مشاغل میں ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی عمر ۸ برس تھی، جب ان کی والدہ محترمہ کا ۱۹۴۸ء میں انتقال ہوا۔ مولانا محمد حیات نے اپنے بچوں کو ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا۔ آدابِ فرزندی سکھائے۔ زمانے کے رواج کے مطابق عربی اور فارسی کی تعلیم دی۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے پانچ بھائی اور چار بہنیں تھیں۔ پانچ بھائیوں میں سے ایک میاں خادم میراں نوشاہی زندہ رہے، باقی تین؛ محمد فاضل، نذر میراں اور عارف میراں بچپن میں انتقال کر گئے۔ میاں خادم میراں نوشاہی نے درویشی اختیار کر لی۔ زندگی بھر والد صاحب کے ساتھ رہے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے سجادہ نشین ہوئے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی ایک انٹرویو میں اپنے خاندان کے بارے میں بتاتے ہیں:

> ''میرے والد صاحب کے چھ بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں، جن میں سے ہم دو بھائی اور ایک بہن موجود ہیں۔ میرے بھائی میاں خادم میراں نوشاہی مجھ سے بڑے ہیں۔ میرے والد صاحب ہماری طالب علمی کے زمانے میں شرق پور سے لاہور آ گئے تھے لہٰذا بڑے بھائی سانده روڈ، لاہور میں مقیم ہیں۔ ان کا گھر مرجعِ خلائق ہے اور لوگ ان سے روحانی اُمور میں فیض یاب ہوتے ہیں۔ ہم دونوں سے

بڑے بھائی تھوڑی عمر پا کر وفات پا گئے تھے۔ میرے ایک بھائی مجھ سے چھوٹے تھے، ان کا نام عارف میراں تھا۔ وہ ساڑھے تین سال کی عمر، میرے زمانۂ ہوش میں فوت ہوئے۔ ہمارے سب سے بڑے بھائی کا نام محمد فاضل تھا۔ یہ بھائی مارچ ۱۹۲۶ء یعنی گلزار نوشاہی کی تالیف تک زندہ تھے۔ ہماری بڑی بہن قرآن خواں، عبادت گزار اور ولیہ تھیں، ان کا نام منور تاج تھا۔ انھوں نے والدہ کی وفات کے بعد ہماری پرورش کی اس لیے ہم بہن بھائیوں کے لیے وہ ماں کا درجہ رکھتی تھیں۔ اب ہم سب بہن بھائیوں میں صرف میری اولاد کو اللہ تعالیٰ نے زندہ رکھا، باقی بہن بھائیوں کے ہاں اولاد ہوئی لیکن اللہ کو ان کی زندگی منظور نہ تھی۔'' (۲۵)

ولادت، تعلیم

نام فضلِ میراں، ادبی نام اور شہرت ڈاکٹر گوہر نوشاہی ہے۔ ۱۵ر جون ۱۹۴۰ء کو شرق پور کے محلہ قصاباں (یہ کسی زمانے میں محلہ جوہالاں بھی کہلاتا تھا) میں اپنے آبائی گھر میں پیدا ہوئے۔ یہ تاریخ پیدائش اکثر جگہوں پر ملتی ہے اور ان کے تعلیمی ریکارڈ میں بھی درج ہے۔ البتہ ان کی تاریخ پیدائش میونسپل کمیٹی شرق پور کے سرٹیفکیٹ پر ۱۸ر جون ۱۹۳۹ء لکھی ہے۔ اس کا سبب شاید انھیں سکول میں داخل کرانے کے موقع پر اندازے کی غلطی ہوگا۔ ۱۹۳۹ء والی تاریخ پیدائش حضرت غلام مصطفیٰ نوشاہی کے ایک خط میں بھی درج ہے۔ حضرت غلام مصطفیٰ نوشاہی (متوفی ۲۱ر فروری ۱۹۶۵ء) نے یہ خط ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے والد محترم مولانا محمد حیات صاحب کو اگست ۱۹۳۹ء کو بچے کی پیدائش پر مبارک باد کے سلسلے میں لکھا تھا۔ اس خط میں حضرت غلام مصطفیٰ نوشاہی نے قطعۂ تاریخ بھی لکھا ہے۔ انھوں نے قطعے میں جو مادۂ تاریخ درج کیا ہے اس کے مطابق ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا سنِ ولادت ۱۹۳۹ عیسوی بنتا ہے۔ سن عیسوی کے علاوہ انھوں نے سن ہجری کا مادۂ تاریخ ''خلف الصدق حیات'' نکالا ہے جس کے مطابق سنِ ولادت ۱۳۵۴ سن ہجری بنتا ہے۔ جبکہ ۱۹۳۹ عیسوی کے حساب سے ۱۳۵۸ سن ہجری ہونا چاہیے تھا، یہاں حضرت غلام مصطفیٰ صاحب کو یقیناً اشتباہ ہوا ہوگا۔ اس مادے میں کوئی تخرجہ ہوگا۔

بہر حال میونسپل کمیٹی والا سرٹیفکیٹ، حضرت غلام مصطفیٰ صاحب کے خط اور سن عیسوی والا مادۂ تاریخ پڑھنے کے بعد بات آئینے کی طرح صاف ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی صحیح تاریخ

پیدائش ۱۸رجون ۱۹۳۹ عیسوی ہے۔ حضرت غلام مصطفیٰ صاحب کا قطعہ تاریخ ملاحظہ فرمائیں:

مولوی صاحب دے گھر لڑکا دتا حق تعالیٰ لکھ لکھ شکر خدا دا کیتا ہووے کرماں والا
غوث الاعظم نوشہ صاحب بھی سچیار معظم راکھے لڑکے سوہنے تائیں دنیا وچ اجالا
شاہ مراد مراداں دیوس یا اقبال اوہ جیوے ہمعصراں وچ روشن پیارا ہووس درجہ بالا
خضر آباد حبیب اوہ ہووے نالے فاضل عالی دل نصاریٰ دا کٹ سمجھیں عیسوی سن کمالا
خلف الصدق حیات عجیبہ ہجری سن مقدس سال تولد نوشاہی نے دسیا خوب نرالا (۲۶)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے شرق پور کے اسلامیہ سکول سے پرائمری تک تعلیم حاصل کی۔ اس زمانے میں پرائمری سکول چوتھی جماعت تک ہوتا تھا چنانچہ پانچویں کے لیے وہ گورنمنٹ ہائی سکول، شرق پور میں داخل ہوئے۔ اولاد کی اچھی تعلیم وتربیت کے پیشِ نظر اُن کے والد محترم مولانا محمد حیات نوشاہی شرق پور چھوڑ کر لاہور آگئے اور یہیں پر سکونت اختیار کی اور سانده روڈ پر مسجد قادریہ کی بنیاد رکھی۔ بعد میں اسی مسجد کے ساتھ مدرسہ قادریہ تعلیم القرآن جاری کیا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے چشتیہ ہائی سکول، لاہور میں چھٹی جماعت میں داخلہ لے لیا۔ انھیں زمانۂ طالب علمی میں کھیلوں سے بھی رغبت تھی۔ خصوصاً فٹ بال کھیلنا انھیں بہت پسند تھا۔ ان کے ماموں میاں محمد حسین شکار سے شغف رکھتے تھے، اس لیے بچپن میں گوہر صاحب نے بندوق چلانا بھی سیکھی تھی۔ (۲۷) میٹرک کرنے کے بعد اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ، لاہور میں داخلہ لے لیا اور وہیں سے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں اسلامیہ کالج، سول لائنز سے گریجویشن کی۔ بی اے میں ان کا پسندیدہ مضمون فارسی تھا۔ بی اے کرنے کے بعد اورینٹل کالج، لاہور میں ایم اے اُردو میں داخلہ لیا۔ ۱۹۶۵ء میں ایم اے اُردو کا امتحان پاس کیا۔ خوش قسمتی سے انھیں تعلیمی عمل کے دوران ڈاکٹر سیّد عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر سجاد باقر رضوی ایسے نامور اساتذہ سے کسبِ فیض کا موقع میسر آیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ان میں کتاب شناسی اور علم دوستی کا ذوق پیدا کیا اور ڈاکٹر سجاد باقر رضوی نے اُن میں تنقیدی شعور اجاگر کیا۔ زمانۂ طالب علمی ہی میں انھوں نے مختلف موضوعات پر مقالات لکھنا شروع کر دیے تھے۔ غنیمت کنجاہی کے حالات اور شاعری کے حوالے سے ان کا مقالہ بی اے کے زمانے میں اورینٹل کالج میگزین میں شائع ہوا۔ اس مقالے کے چھپتے ہی ڈاکٹر گوہر نوشاہی علمی و ادبی حلقوں میں متعارف ہو گئے۔ ایم اے اُردو کرنے کے باوجود اُن کی

فارسی زبان سے وابستگی قائم رہی۔

مقالہ نگاری اور تحقیقی کام کے حوالے سے کالج کے زمانے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا شمار اُن چند طلبا میں ہوتا تھا جنھیں ہر سال علمی کارکردگی پر سندِ امتیاز ملتی تھی۔ رفعت ناہید (ان کی کالج کی ہم جماعت اور دوست) اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں:

> ''کالج کے زمانے میں تنقید کی کلاس میں اکثر میں چڑ جایا کرتی تھی جب سیّد عبداللہ صاحب بار بار گوہر نوشاہی کا حوالہ دیا کرتے تھے، آج میرے دوست گوہر نے یوں فرمایا، یا میرے دوست گوہر نے یوں لکھا وغیرہ۔ میں نے اعلان کرنا چاہا کہ سیّد صاحب کو چاہیے کہ گوہر کی علیحدہ کلاس لیا کریں، گوہر نہ ہوا ارسطو ہو گیا۔ مگر میں کہہ نہ سکی۔ اور جب تک سیّد عبداللہ موجود رہے، یہ چرچا عام رہا۔ (۲۸)

اسلامیہ کالج میں تعلیم کے دوران وہ انجمن عربی و فارسی اور اورینٹل کالج میں طالب علمی کے دوران حلقۂ شیرانی کے معتمد تھے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کو جہاں نام ور اساتذہ سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا وہیں زمانۂ طالب علمی ہی میں جناب خلیل الرحمٰن داؤدی ایسے دانشور اور محقق کی سرپرستی بھی نصیب ہوئی۔ جناب خلیل الرحمٰن داؤدی سے پہلی ملاقات کے حوالے سے تہمینہ ناز کو انٹرویو دیتے ہوئے ڈاکٹر گوہر نوشاہی بتاتے ہیں:

> خلیل الرحمٰن داؤدی صاحب کو بحیثیت محقق میں زمانۂ طالب علمی ہی سے جانتا تھا۔ ان سے پہلی ملاقات ڈاکٹر ممتاز حسن کی وساطت سے ہوئی۔ داؤدی صاحب حافظ محمود شیرانی کے بعد برصغیر کے سب سے بڑے کتاب شناس تھے۔ عربی، فارسی اور اُردو مآخذ پر اُن کی گہری نظر تھی۔ (۲۹)

اس طرح سیّد امتیاز علی تاج سے بھی ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی پہلی ملاقات زمانۂ طالب علمی (بی اے کے آخری سال) میں ہوئی۔ ان دنوں ڈاکٹر گوہر نوشاہی اپنے تعلیمی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے کلاسیکی متون کی تدوین میں جناب خلیل الرحمٰن داؤدی کے ساتھ بطور معاون کام کر رہے تھے۔ داؤدی صاحب کی صحبت نے ان کی تحقیقی استعداد اور ذوق کو نکھارا۔ جناب خلیل الرحمٰن داؤدی نے انھیں تحقیق کے مآخذ سمجھائے اور تصحیحِ متن کی طرف راغب کیا۔ ان میں نسخہ شناسی اور متن خوانی کا شعور اُجاگر کیا اور اپنے حلقہ احباب میں متعارف کروایا۔ خصوصاً ڈاکٹر ممتاز حسن اور سیّد امتیاز علی تاج

تک اُن کی رسائی ممکن بنائی۔ جناب خلیل الرحمٰن داؤدی دراصل ان کی تعلیمی کفالت کرنا چاہتے تھے۔ وہ اس سلسلہ میں بہت فکر مند رہتے تھے۔ داؤدی صاحب کی دوررس نگاہیں ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا تحقیقی ذوق دیکھ چکی تھیں۔ شاید انھوں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ طالب علم ایک دن تحقیق کے میدان میں ضرور نام پیدا کرے گا۔ سیّد امتیاز علی تاج سے داؤدی صاحب کے مراسم بہت اچھے تھے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی امتیاز علی تاج سے اپنی پہلی ملاقات کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں:

> مجھے یاد ہے کہ میں ایک دوپہر داؤدی صاحب کے گھر بیٹھا کسی کلاسیکی متن پر ان سے مشورہ لے رہا تھا کہ اچانک تاج صاحب آ گئے...... داؤدی صاحب نے چند جملوں میں میرا تعارف اس طرح کرایا، ''یہ گوہر نوشاہی ہیں۔ اسلامیہ کالج کے طالب علم ہیں۔ تحقیق کا شوق ہے اور ڈاکٹر وحید قریشی کے شاگرد ہیں'' ...... اس کے بعد سیّد امتیاز علی تاج سے میری نیاز مندانہ دوستی کا سلسلہ جاری ہو گیا اور میں نے ڈاکٹر وحید قریشی اور جناب خلیل الرحمٰن داؤدی کے مشورے سے مظہر علی ولا کی بیتال پچیسی کی تدوین میں ہاتھ ڈال دیا۔ جو مجھ سے نومشق کے لیے مشکل بھی تھی اور صبر آزما بھی۔(۳۰)

اس طرح بیتال پچیسی کی تدوین کی صورت میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا اُردو میں پہلا تدوینی کام منظرِ عام پر آیا۔ ہمارے ہاں تحقیقی وسائل کی بہت کمی ہے زمانۂ طالب علمی ہی میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی کو تعلیمی اور ذاتی اخراجات پورے کرنے کے لیے قلمی مزدوری کرنا پڑتی تھی۔ مجلس ترقی ادب میں ان دنوں سیّد عابد علی عابد صحیفہ کے مدیر تھے۔ ان تک بھی رسائی حاصل ہو گئی۔ سیّد عابد علی عابد ان سے صحیفے میں کتابوں پر تبصرے کروا کر ان کی مالی معاونت کرتے تھے۔ اس طرح ڈاکٹر گوہر نوشاہی کو ایک مایہ ناز محقق اور دانش ور سے فیض یاب ہونے کا موقع میسر آ گیا۔ سیّد عابد علی عابد نے ان میں شعر خوانی اور شعر فہمی کا ذوق پیدا کیا۔ سیّد عابد علی عابد سے ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے شعر کی روح تک پہنچنے کا سلیقہ سیکھا۔

سیّد امتیاز علی تاج ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے ایک طرح کے محسن ٹھہرے، جن کی وجہ سے انھیں آگے بڑھنے کے مواقع نصیب ہوئے۔ تاج صاحب نے کئی حوالوں سے ان کی مدد کی، چنانچہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں:

سیّد امتیاز علی تاج نے میری مدِ معاش کا ایک اور سلسلہ یوں پیدا کیا کہ مجلس سے شائع ہونے والی ہر تازہ کتاب مجھے بھجواتے تھے۔ اور ہدایت تھی کی اسے پڑھ کر پروف خوانی کی اغلاط کی نشاندہی کروں۔ کتاب کا فی صفحہ پڑھنے کے دو آنے، پڑھنے کے بعد غلطی نکالنے پر فی غلطی چار آنے الگ ملتے تھے۔ نیز شائع ہونے کے بعد کتاب کا ایک نسخہ مفت ملتا تھا۔ اس طرح مجھے نہ صرف ایک اہم ادبی کتاب بلا قیمت مل جاتی تھی بلکہ ہر کتاب پر ایک اچھی مزدوری بھی میسر آجاتی تھی۔ یہ سلسلہ جاری رہا تا آنکہ تاج صاحب نے ۱۹۶۶ء میں مجھے مجلس ترقی ادب کی ملازمت میں لے لیا اور میرا عہدہ سیّد عابد علی عابد اور جناب کلب علی خاں فائق کے ساتھ مدیرِ کتب قرار پایا۔ سیّد عابد علی عابد کی علالت کے باعث مجلس نے انھیں گھر بیٹھ کر کام کرنے کی اجازت دے دی تھی اور ان کا کمرہ، سامانِ تحریر اور فرائض مجھے سونپ دیے گئے۔ (۳۱)

ملازمت اور تدریسی خدمات

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کو ایم اے اُردو کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی گورنمنٹ ڈگری کالج، قصور اور اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ، لاہور کے پرنسپل صاحبان کی طرف سے مذکورہ کالجوں میں بطور لیکچرار کام کرنے کی پیشکش کی گئی تھی لیکن ڈاکٹر صاحب نے بوجوہ معذرت کر لی۔ (۳۲)

ایم اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۶۶ء میں گوہر نوشاہی صاحب پہلے پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج کے شعبہ پنجابی سے منسلک ہوئے۔ وہاں ایک ماہ (مئی تا جون ۱۹۶۶ء) تک بطور رُکن شعبہ ادارت تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند اپنی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۶ء ہی میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے مجلس ترقی ادب میں سیّد عابد علی عابد اور کلب علی خاں فائق کے ساتھ بطور مدیر کتب ملازمت اختیار کر لی (جون ۱۹۶۶ء تا فروری ۱۹۷۲ء)۔ مجلس ترقی ادب میں ملازمت کے دوران ان کی شخصیت کے کئی پہلو کھل کر سامنے آئے اور تحقیق و تدوین ان کے مزاج میں شامل ہوگئیں، خصوصاً تاج صاحب کی رہنمائی سے ان کی شخصیت میں نکھار پیدا ہو گیا۔ لاہور میوزیم مخطوطات کمیٹی کی رکنیت جو سیّد امتیاز علی تاج کے پاس تھی انھوں نے اپنی جگہ یہ ذمہ داری ڈاکٹر گوہر نوشاہی کو سونپ دی اور میوزیم والوں کو خط کے ذریعے مطلع کر دیا کہ اب میری جگہ

گوہر نوشاہی مخطوطات کی جانچ پڑتال کیا کریں گے۔[۲۳] ۱۹۷۲ء میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی مشہد یونیورسٹی ایران کی طرف سے پاکستان شناسی اور اُردو زبان وادب کے استاد کی حیثیت سے مدعو کیے گئے۔ وہاں انھوں نے اُردو کے لیے بہت خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۹ء تک ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے مشہد یونیورسٹی (ایران) میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ اُردو زبان کی ابتدائی اور اعلیٰ سطح کی تدریس کے علاوہ اُردو ادب کے چند موضوعات بھی پڑھائے۔ ان میں اقبالیات، تاریخ زبان اُردو، قابلِ ذکر ہیں۔ قیام مشہد کے دوران اقبالیات اور پاکستان شناسی کے حوالے سے ان کی فارسی تحریریں مشہد کے اخبارات، روزنامہ خراسان اور آفتابِ شرق وغیرہ میں شائع ہوتی رہیں۔ ۱۹۸۳ء میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی پاکستان ایجوکیشنل سنٹر دوحہ میں بطور لیکچرار چلے گئے اور تقریباً تین سال تک خدمات سرانجام دیتے رہے۔ پاکستان ایجوکیشنل سنٹر کی طرف سے سفینہ کے نام سے ایک علمی وادبی مجلّہ بھی جاری کیا اور مدیرِ اعلیٰ کے فرائض انجام دیے۔ یہ مجلّہ قطر میں پاکستانی زبان و ادب اور ثقافت کا نمائندہ تصور کیا جاتا تھا اور اپنے اخراجات میں خود کفیل تھا، کیونکہ ڈاکٹر صاحب اس کی اشاعت کے لیے اشتہارات حاصل کرلیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی جب قطر سے واپس پاکستان آئے تو مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد سے منسلک ہوگئے۔ چنانچہ ۱۹۸۵ء میں مقتدرہ قومی زبان میں بطور ڈپٹی ڈائریکٹر اپنی خدمات کا آغاز کیا۔ یہاں بھی تحقیق کے حوالے سے انھوں نے نمایاں کام کیا۔ مقتدرہ کی ملازمت سے ۱۵ر جون ۲۰۰۰ء کو ساٹھ برس کی عمر میں سبک دوش ہوئے۔ جنوری ۲۰۰۱ء میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز سے بحیثیت وزٹنگ پروفیسر منسلک ہوئے، جہاں ان کی مصروفیت جاری ہے۔

ازدواج

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی وقتاً فوقتاً دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی ڈاکٹر ممتاز گوہر سے ۱۷ر مارچ ۱۹۷۲ء کو اور دوسری شادی محترمہ فرحت گوہر سے ۹ر فروری ۱۹۹۴ء کو انجام پائی۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی پہلی بیگم ڈاکٹر ممتاز گوہر ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ محقق خواتین میں ان کا بڑا نام ہے۔ ان کی متعدد کتابیں مجلس ترقی ادب، لاہور؛ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور اور مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد سے شائع ہو چکی ہیں۔ انھوں نے خلیفہ عبدالحکیم پر تحقیقی کام کیا اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر کے مقالات مرتب کیے۔ علاوہ ازیں پنجاب کے ادب پر بھی ان کا وقیع کام ہے۔ ڈاکٹر

ممتاز گوہر کی شخصیت اور ادبی خدمات پر عاصمہ بشیر نے تحقیقی مقالہ بہ عنوان ''ڈاکٹر ممتاز گوہر کی ادبی خدمات'' جنوری ۲۰۰۰ء میں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد (قائد اعظم یونیورسٹی، اسلام آباد) کے زیر اہتمام لکھا تھا۔ شادی کے بعد ممتاز گوہر ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے ہمراہ ایران چلی گئیں۔ وہاں ان کا بہت اچھا وقت گزرا۔ ایران کے بعد ڈاکٹر ممتاز گوہر ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے ہمراہ دوحہ (قطر) چلی گئیں اور وہاں پاکستان ایجوکیشنل سنٹر میں ملازمت اختیار کی۔ ممتاز گوہر سے گوہر نوشاہی کے دو بیٹے نوید گوہر اور فرید گوہر پیدا ہوئے۔ ۱۹۸۵ء کا سال ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے لیے بہت مصیبتیں لایا۔ ممتاز گوہر چھاتی کے سرطان میں مبتلا ہو گئیں۔ بہت علاج معالجہ کیا گیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ۲۶ر رمضان المبارک/ ۲۴ر مئی ۱۹۸۷ء کو ڈاکٹر ممتاز گوہر اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئیں۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی اور ڈاکٹر ممتاز گوہر تقریباً پندرہ برس تک رشتہ ازدواج میں منسلک رہے۔ میاں بیوی کی آپس میں بہت ذہنی ہم آہنگی تھی۔ (۳۴)

ڈاکٹر ممتاز کی کمی کا اثر بچوں پر شدید ہوا۔ والدہ کی وفات کے وقت نوید گوہر کی عمر تیرہ برس تھی اور فرید گوہر گیارہ برس کے تھے۔ گھر میں بہت مسائل درپیش تھے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے ان دونوں بچوں کو لارنس کالج، مری میں داخل کروا دیا۔ بچوں کو ایک تو ماں کی وفات کا صدمہ، دوسرا باپ سے جدائی کا غم، ان کا ہوسٹل میں جی نہ لگا۔ بالآخر انھیں ہوسٹل سے واپس لانا پڑا۔ اس طرح ان کا بہت سا قیمتی وقت ضائع ہو گیا۔ ڈاکٹر ممتاز گوہر کی وفات کے بعد تقریباً سات سال کا عرصہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے تنہا گزارا۔ پھر خاندان والوں کے بار بار اصرار پر دوسری شادی کے لیے رضامند ہو گئے۔ ۹ر فروری ۱۹۹۴ء کو ان کی دوسری شادی محترمہ فرحت گوہر سے ہوئی۔ (۳۵)

فرحت گوہر بھی بہت سلیقہ مند اور خوش اخلاق خاتون ہیں۔ ان کا تعلق لاہور کے ایک گھرانے سے ہے۔ ان کے والد شوکت حسین شوکت لاہور سے ایک اخبار آفاق کے نام سے نکالتے ہیں۔

اولاد

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ بڑے بیٹے نوید گوہر ہیں، انھوں نے ایم اے اُردو کیا ہے۔ مری کے قریب ایک پرائیویٹ کالج میں لیکچرر ہیں۔ بہت پیارے انسان ہیں۔ چھوٹے بیٹے فرید گوہر ان دنوں امریکہ میں ہیں۔ بہت بااستعداد، سعادت مند، محبت کرنے والے

انسان ہیں۔ اور بیٹی کا نام فرحین گوہر ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے بیٹے نوید گوہر کی ولادت پر صاحبزادہ نصرت نوشاہی نے نظم لکھی تھی۔ جو چھوٹے سائز کے پرنٹڈ لیٹر پیڈ پر ان کے قلم سے لکھی ہوئی میرے سامنے ہے جس پر ان کا پتا روشن دواخانہ (رجسٹرڈ) حضرت ہرنی شاہ سٹریٹ، شیخوپورہ ٹاؤن، ضلع شیخوپورہ لکھا ہوا ہے۔ یہاں اس نظم کے اشعار کا اندارج قارئین کی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

(ہنگامِ ولادت نوید سرودہ شد)

مژدۂ آمد بگوشم پیکِ مُشتاقاں رسید — رونقِ چشمانِ ما باصورت جاناں رسید
برفرازِ شاخساراں غنچۂ خنداں رسید — غازۂ نیرنگِ قدرت بر رُخِ خوباں رسید
صد نگارِ زندگانی جلوہ ہا کردن نمود — راحتِ جاں گرد منزل، رحمت یزداں رسید
یک بیک آمد عروسِ خوش خرامانِ بہار — در ریاضِ دلنوازاں بادِ عطر افشاں رسید
برگ و بار آورد نخلِ آرزو ہائے حیات — نعمتے از لطفِ داور در کفِ ایشاں رسید
یک نمائے دلکشائے در سرائے آب و گل — با کرشمہ سازی و با پرتوِ رخشاں رسید
دولتے مر پیدا گشت و گنج پنہاں شد پدید — بسکہ در آغوشِ مادر، نیر تاباں رسید
رُوئے خود بنمود آخر گوہرِ کانِ وجود — تہنیت بادا چراغِ خانۂ میاں رسید
شکر برخوانم کہ پدرے دید پسرے ارجمند — ارمغانِ نقشِ فطرت سوئے مشتاقاں رسید
داد پیغام آشنائی طفلکِ فرخندہ پے — چوں ھجومِ جلوہ بازاں غلغلہ خیزاں رسید
بر سرِ شاخِ تمنا منتِ تزئیں نہاد — آں گلِ رعنا کہ در دامانِ ما خنداں رسید
عافیت بخش نگاہاں، باعثِ تسکینِ جاں — خاطر افروزِ عزیزاں، خادمِ میراں رسید
عاشقاں را شُد میسر فرصتِ روزِ وصال — مرحبا ذوقِ طلب کاں زیبِ مہ رُویاں رسید
می سراید نغمہ ہا تارِ رُبابِ ہر نفس — من نمی دانم کجا ایں حضرتِ انساں رسید
آسمانِ تازہ شُد پیدا جہانے دیگرے — صاحبِ خانۂ چو در کاشانۂ ویراں رسید
نقشہائے رنگ رنگ آمد بدامانِ خیال — بر سپہرِ نیلگوں آہنگِ پر افشاں رسید
درمیانِ گفتنی ہا حرف شوق آوردہ ام — زیں نمط گلبانگِ نصرت در سخن گویاں رسید

شخصیت

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا تعلق ایک صوفی گھرانے سے ہے اس لیے ان کی عادات و خصائل

میں پاکیزگی کا در آنا حیرانی والی بات نہیں۔ خوش لباس، نرم خو اور صلح جو انسان ہیں۔ کبھی کبھار لہجے میں تلخی آجاتی ہے لیکن غصہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ وہ بات کو منہ پر کہہ دینے کے عادی ہیں جس کے کبھی کبھی اچھے اثرات ظاہر نہیں ہوتے، لیکن وہ دل میں کسی کے لیے بغض و کینہ رکھنے کے روادار نہیں ہیں۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی ۱۹۸۴ء میں حج بیت اللہ کا فریضہ بھی ادا کر چکے ہیں۔ اس سے پہلے دو بار عمرے کی سعادت حاصل کی تھی۔ اُن کی شخصیت میں توکل اور قناعت کا عنصر نمایاں ہے، شاید یہ ان کے خاندان کے عمدہ اثرات کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے بڑی عظیم اور معروف دانشور شخصیات کی صحبت میں وقت گزارا۔ اُن میں بطور خاص ڈاکٹر سیّد عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، خلیل الرحمٰن داؤدی، سیّد امتیاز علی تاج، سیّد عابد علی عابد، ڈاکٹر جمیل جالبی، جناب مشفق خواجہ، کلب علی خاں فائق رام پوری وغیرہ ایسی نفیس شخصیات شامل ہیں۔ اسی لیے اُن کی شخصیت میں علم دوستی، کتاب شناسی، محنت اور نفاست طبع ایسی خصوصیات کا در آنا ضروری تھا۔ وہ کتاب خواں بھی ہیں اور کتاب شناس بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا کتب خانہ بے شمار نادر و نایاب کتب کے ذخیرے سے مزیّن ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی پنجاب کے علم و ادب پر خاصی دسترس رکھتے ہیں۔ اُردو اور پنجابی کے علاوہ فارسی روانی سے بول سکتے ہیں، یہ خوبی ان میں ایران میں وقت گزارنے کے بعد پیدا ہوئی۔ البتہ اُن کا گھرانہ اور ان کے والد صاحب عالم دین ہونے کی وجہ سے انھیں بچپن ہی میں عربی اور فارسی کی طرف راغب کیا گیا تھا۔ لیکن ایران میں قیام کے دوران میں ان کی فارسی دانی میں بہت اضافہ ہوا۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی شخصیت گوناگوں اوصاف اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ ادبی حوالے سے ان کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں، وہ محقق، نقاد، شاعر، مترجم، ایڈیٹر اور کالم نگار ہیں۔ ذاتی حوالے سے اُن کی شخصیت خوش گفتاری، ملنساری، مہمان نوازی، اخلاص و مروّت اور علمی راہبری ایسی خصوصات کی حامل ہے۔ بطور دوست، استاد، شوہر، باپ اُن کی شخصیت قابلِ تحسین ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے بچپن کے دوست بیرسٹر صابر کیفی اپنے مراسلے بنام راقم الحروف میں لکھتے ہیں:

> ہم دوست اپنی محفلوں میں ایک دوسرے پر طنز بھی کرتے تھے، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی رغبت بھی رکھتے تھے۔ اور ایک دوسرے کی تضحیک اڑانے میں بھی احتیاط سے کام نہیں

لیتے تھے۔ گوہر نوشاہی بھی دوسروں کی طرح تمام امور کی زد میں آتا تھا مگر مجھے کوئی ایک واقعہ بھی ایسا یاد نہیں کہ کسی دوست کے تلخ سے تلخ جملے کے ردِعمل کے طور پر گوہر نوشاہی نے کسی کی دل آزاری کی ہو۔ گوہر نوشاہی کا سخت ترین ردِعمل اس کا خاموشی اختیار کر لینا ہوتا تھا جس سے ہم سمجھ جاتے تھے علامہ ہم سے ناراض ہے۔ لیکن اُسے منا لینے کا طریقہ بھی دوستی کی پائیداری ہی کی علامت تھا۔ جب وہ خاموشی اختیار کر لیتا...... ہم تقاضا کرتے کہ اگر تم ہم سے ناراض نہیں ہو تو ہمیں اپنے گھر لے جا کر کھانا کھلاؤ، اور وہ فوراً تیار ہو جاتا...... گوہر نوشاہی کی پیشانی پر کبھی بَل نہیں آیا۔ گوہر نوشاہی فطرتاً مہمان نہیں بلکہ میزبان واقع ہوا تھا...... ہمارے زمانے میں آئے دن بین الکلیاتی مشاعرے، تقریری مقابلے، انعامی شعری اور تنقیدی نشستیں منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ بعض اوقات بعض نشستوں میں نمائندگی کے لیے مناسب مقابلہ کرنے والا میسر نہ ہوتا یا سینئرز کی دیگر نشستوں میں مصروفیت کی وجہ سے دستیابی نہ ہوتی تو ایسی صورت میں گوہر نوشاہی مطلوبہ نظم یا غزل لکھ کر جونیئر شریک کے سپرد کر دیتا جو اسی کی تخلیق ہو جاتی۔ اور اگر ایسی کسی تخلیق کو انعام کا مستحق ٹھہرایا جاتا تو پڑھنے والا ہی وہ انعام حاصل کرتا۔ (۳۶)

ایران کے معروف شاعر ڈاکٹر محمد حسین تسبیحی رہا کا شمار ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے دوستوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار نظم میں کیا ہے۔ یہ اشعار کاغذ کے چھوٹے سے ٹکڑے پر ان کے قلم سے لکھے ہوئے میرے سامنے ہیں جس پر تاریخ ۱۰ر جنوری ۲۰۰۴ء درج ہے۔ ان اشعار کا اندراج یہاں ضروری سمجھتا ہوں۔ اشعار دیکھیے:

توی نوشاہی شیریں زبانم	توی ماہِ محبت مہربانم
دو چشمت روشنی بخشِ دلِ من	توی چشمکِ زناں در قلب و جانم
رہا وردِ زبان نوشاہیان است	کمالِ عاشقاں را پاسبانم

ڈاکٹر عبدالغفور شاہ قاسم اپنے مراسلے بنام راقم الحروف میں لکھتے ہیں:

محترمی ڈاکٹر گوہر نوشاہی صاحب انتہائی دلنواز، ملنسار اور مہمان نواز شخصیت ہیں۔ اپنے تلامذہ کے لیے بے حد شفیق اور مشکل مرحلے پر بہترین معاون ہیں۔ ان کی علمی رہنمائی میں کام کرنے والے طلبا کو کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ وہ قدم قدم پر براہِ راست یا بالواسطہ (ٹیلی فون پر) اپنے شاگردوں کی رہنمائی کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں...... اُن کی علمی گہرائی اور گیرائی نے انھیں وسعت قلبی عطا کی ہے۔ کسی علمی مسئلے پر سخن طراز ہوتے ہیں تو بقول شاعر یوں محسوس ہوتا ہے:

بات کرتا ہے کہ خوشبو کو بدن دیتا ہے
اس کا لہجہ تو گلابوں کو دہن دیتا ہے

...... وہ مستقل اور مسلسل تعلق رکھتے ہیں اور اپنے شاگردوں کی کوتاہیوں سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔ ایک کشادہ ظرف راخون فی العلم شخصیت جن کی شاگردی میں آجانا نہایت خوش بختی اور یقینی کامیابی کی ضمانت ہے۔ (۳۷)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی شخصیت پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر طارق ہاشمی رقم طراز ہیں:

کہتے ہیں جن لوگوں میں علم کی کمی ہوتی ہے وہ اس کمی کو حلم سے پورا کرتے ہیں۔ لیکن گوہر صاحب کی ذات علم اور حلم کا مجموعہ ہے۔ ان کی ذات میں علم کا سحر اور حلم کا سحر یک جا ہیں۔ (۳۸)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی شخصیت کی ایک اور اہم خوبی یہ ہے کہ وہ بلا کا حافظہ رکھتے ہیں۔ کلاسیکی شعرا کے ہزاروں اشعار حافظے میں محفوظ ہیں۔ موقع کی مناسبت سے انھیں برمحل استعمال کرتے ہیں اور حیرت زدہ کر دیتے ہیں۔ عجز و انکسار اور علمی وقار کی عمدہ مثال ہیں۔ ڈاکٹر شفیق انجم اپنے مراسلے بنام راقم الحروف میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی شخصیت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں۔

میرا ایک مدت تک اُن (ڈاکٹر گوہر نوشاہی) سے بہت قریبی تعلق رہا ہے۔ میں نے ایک طالب علم کی حیثیت سے ان کی علمی اور شخصی اوصاف کا خوب مطالعہ کیا

اور یہ جانا کہ وہ ایک نہایت ہمدرد اور نفیس انسان ہیں۔ بہت سوں کو ان سے شکایت بھی ہوگی۔ اس لیے جاہل کو جاہل اور کم تر کو کم تر کہنے میں انھیں کچھ تامل نہیں ہوتا۔ علمی حقائق اور معیار بندی میں وہ کسی رُو رعایت کے قائل نہیں۔ عام زندگی میں بھی بسا اوقات یہ وجاہت ان کے حوالے سے تاثر کو خراب کرتی ہے۔ لیکن میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ گوہر نوشاہی صاحب کو کبھی بھی کسی سے ذاتی پرخاش قطعاً نہیں رہی۔ وہ تو ایک درویش صفت انسان ہیں، اور درویش ذاتی عداوتیں نہیں پالتے۔ (۳۹)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی شخصیت کا ایک اور اہم پہلو اُن کی شاعری ہے۔ ابتدا میں بطور شاعر وہ ادب کی دنیا میں نمودار ہوئے۔ بعد میں انھوں نے تحقیق و تدوین کا شعبہ اپنے لیے منتخب کر لیا۔ ان کی نثر میں جو شیرینی اور گھلاوٹ کا عنصر ملتا ہے وہ ان کے شاعرانہ مزاج کی دین ہے۔ انھیں زمانہ طالب علمی میں شاعری سے خاص رغبت رہی ہے۔ زمانۂ طالب علمی میں انھوں نے بہت سے مشاعروں میں حصہ لیا اور انعامات بھی حاصل کیے۔ (۴۰)

ڈاکٹر صاحب کی ادبی شخصیت پر محترمہ رفعت ناہید خشک ہونٹوں کا گیت میں رقم طراز ہیں:

گوہر نوشاہی کی شاعری کے متعلق کیا عرض کروں، اگر میں یہ کہوں کہ مجھے اس کی تمام نظمیں پسند ہیں تو شاید آپ یقین نہ کریں...... گوہر کی نظم پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ نظمیں سلیقہ جذبات کی پختگی اور بے ساختگی کی بدولت پڑھنے والوں کو ایسا سماں مہیا کرتی ہیں جسے صرف دل کن آنکھ دیکھتی ہے اور جس کے سرور کو محض روح ہی محسوس کرتی ہے۔ (۴۱)

''مجلس ترقی ادب'' میں شمولیت کے بعد انھوں نے مکمل طور پر شاعری کو خیر باد کہہ دیا اور نثر کی طرف متوجہ ہوگئے۔ شاعری ترک کرنے کا مؤقف یہ اختیار کیا کہ بحیثیت شاعر اُن سے ہر شخص بہتر ہے۔ ادبی مقام حاصل کرنے کے لیے انھیں شاعری کے بجائے نثر پر توجہ دینا چاہیے۔ اسی چیز کے پیشِ نظر انھوں نے اپنی مکمل توجہ نثر پر مرکوز کر دی۔ ویسے تو تحقیق کے میدان میں زمانہ طالب علمی ہی میں قدم رکھ چکے تھے، لیکن مجلس ترقی ادب میں آنے کے بعد مکمل طور پر تحقیق کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

[ڈاکٹر گوہر نوشاہی] مہذب و شائستہ انسان ہیں۔ نرم خو بھی اور صلح جو بھی ہیں۔
دوستی کرنے دوستی نبھانے کا ہنر جانتے ہیں۔ (۴۲)

افتخار عارف ایک انٹرویو میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی شخصیت کے بارے میں کہتے ہیں:

گوہر نوشاہی محققین کی طرح ٹھوس تو ہیں مگر شخصیت میں حد درجہ انکساری اور فروتنی ان کا خاصہ ہے۔ مالی اعتبار سے دیانت دار آدمی، علمی معاونت میں ہر وقت کشادہ دلی سے تیار نظر آتے ہیں۔ امتیاز علی تاج، حمید احمد خاں، خلیل الرحمٰن داؤدی اور مشفق خواجہ ان کے مداحین میں تھے۔ (۴۳)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی بیگم محترمہ فرحت گوہر کے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے بارے میں چند تاثرات:

''گوہر ایک بہت ہی سمجھ دار انسان ہیں۔ ہر رشتے کی اہمیت کا احساس رکھتے ہیں اور ذمہ داری کے ساتھ ہر رشتے کا حق ادا کرتے ہیں۔ بہت ہی محبت، عزت اور خیال رکھنے والے شوہر ہیں۔ زندگی کے ہر موڑ پر ساتھ نبھانے والے ہیں۔ اس بات کو یوں کہہ لیں کہ اگر کبھی کوئی بھی مشکل وقت آیا ہے تو انھوں نے پُرخلوص مشوروں سے نوازا ہے اور ہر لمحہ ہر گھڑی ساتھ نبھایا ہے۔ انھوں نے کبھی کسی بھی لمحے اکیلے ہونے کا احساس تک نہیں ہونے دیا۔ ایک بہت ہی گھنے چھاؤں دار درخت کی مانند ہیں جس کے سائے میں سکون، آرام، عزت، محبت دولت غرضیکہ زندگی کا ہر آرام میسر ہوا۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ میرے بچوں کے لیے وقف ہے۔ صرف اپنے لیے ان کے پاس شاید کوئی وقت نہیں ہے۔ اور یہ اپنا علمی و ادبی کام بھی اتنی ذمہ داری اور محنت کے ساتھ کرتے ہیں کہ میں ہر لمحہ حیران ہوتی ہوں کہ یہ اتنی ہمت کہاں سے لاتے ہیں۔ وہ ہر کام کو، ہر ذمہ داری کو، انصاف کے ساتھ پورا کرتے ہیں اور ایسی خوش اُسلوبی سے کرتے ہیں کہ میں تو حیرت زدہ رہ جاتی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب بہت پُرخلوص اور سادہ طبیعت کے انسان ہیں جن کے پاس زندگی کے ہر سوال کا جواب موجود ہے۔'' (۴۴)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے بیٹے نوید گوہر کے تاثرات (نوید گوہر تاریخ ولادت ۱۰ اراگست

۱۹۷۴ء)

یوں تو سب والد اپنی اولاد سے محبت کرتے ہیں لیکن میرے والد صاحب نے مجھ سے جو محبت کی وہ خاص ہے۔ ہمیشہ ان کی یہ کوشش رہی ہے کہ وہ مجھے زندگی کی ہر ممکن آسائش مہیا کریں۔ نہ صرف علمی طور پر انھوں نے مجھے مضبوط کیا بلکہ اس بات کا بھی خیال رکھا کہ میں کسی قسم کے احساسِ کمتری کا شکار نہ ہوں۔ ہمیشہ وہ مجھ سے شفقت سے پیش آئے۔ جب بھی مجھے کوئی مشکل پیش آئی انھوں نے مجھے بھرپور حوصلہ دیا اور میرا ساتھ دیا۔ انھوں نے مجھے کتاب کی اہمیت سے روشناس کروایا۔ انھوں نے مجھے تعصبات سے دور کر کے لوگوں کے ساتھ محبت اور اتفاق کا درس دیا۔ انھوں نے مجھے نہ صرف بڑوں کا احترام اور چھوٹوں سے پیار کرنا سکھایا بلکہ لوگوں کی قدر کرنا بھی سکھایا۔ انھوں نے ہمیشہ پہلے میرے مسائل کو اہمیت دی اور بعد میں اپنے مسائل کی طرف دھیان دیا۔ مجھے صوفیائے کرام کی عزت اور احترام کا درس دیا اور زندگی کی تیز دھوپ سے نکال کر انھوں نے ہمیشہ اپنی محبت کا سایہ فراہم کیا۔ الغرض میری شخصیت کو سنوارنے نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ (۴۵)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے چھوٹے بیٹے فرید گوہر مقیم امریکہ ان کی شخصیت پر بذریعہ ٹیلی فون اپنے تاثرات دیتے ہوئے کہتے ہیں:

ابو کے بارے میں میرے تاثرات یہ ہیں کہ انھوں نے مجھے اچھے سکولوں میں پڑھایا۔ ماں باپ بن کر پالا۔ تعلیم پر زور دیا۔ گھر سے تعلیم دینا شروع کی۔ تربیت جو ایک اچھا انسان کر سکتا ہے کی۔ ان کی شخصیت میں روحانیت ہے۔ وہ محبت کی نمود و نمائش نہیں کرتے مگر درحقیقت نہایت محبت کرنے والے انسان ہیں۔ وہ محبت میں عمل پر زیادہ یقین رکھتے ہیں اور لفظوں پر کم۔ محبت بغیر کسی مطلب کے کرتے ہیں۔ وہ مستقل مزاج ہیں۔ انھوں نے اپنی اولاد کو ہمیشہ حوصلہ اور ہمت سکھائی۔ جب بھی مجھے مشکل پیش آئی انھوں نے مجھے حوصلہ دیا اور میرا بھرپور ساتھ دیا۔ زندگی کے دشوار راستوں پر انھوں نے ایک رہبر اور رہنما کا

کردار ادا کیا۔ لباس میں انھیں سفید رنگ پسند ہے۔ وہ اعلیٰ اور نفیس لباس پہنتے ہیں۔ وہ علم کا ایک خزانہ ہیں۔ "His accuracy and validity of knowledge is well known."(۴۶)

اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی بڑی شخصیت کی ذاتی اور پیشہ وارانہ زندگی میں توازن قائم نہیں رہتا۔ فرائضِ منصبی کی وجہ سے اس کی گھریلو زندگی بعض اوقات عدم توازن کا شکار ہو جاتی ہے، لیکن ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی زندگی میں توازن اور اعتدال نظر آتا ہے۔ یہ ان کی کامیاب زندگی اور ہمہ پہلو شخصیت کی دلیل ہے۔ اُن کے خانگی حالات بچوں کی تعلیم و تربیت، دوستوں، شاگردوں اور علمی و ادبی شخصیات سے روابط ہر بات میں توازن نظر آتا ہے۔ اگرچہ انھوں نے زندگی میں بہت سے نشیب و فراز دیکھے ہیں، زندگی میں بہت مسائل اور صدمات سے دوچار ہوئے ہیں، لیکن ان تمام مشکلات اور مسائل کے باوجود انھوں نے اپنے خاندان پر پوری توجہ دی ہے۔ دوستوں کے ساتھ دوستی نبھائی ہے اور ہر رشتے کے تقدس کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔

مشاغل

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے محبوب مشغلے ذیل میں درج ہیں:

۱۔ نادر و نایاب کتب کی جمع آوری

۲۔ نادر و نایاب رسائل کی جمع آوری اور مطالعہ

۳۔ عتیقی نوعیت کی چیزوں کی جمع آوری، جن میں قدیم سکے مخطوطات اور کتاب کے فرسٹ ایڈیشن وغیرہ شامل ہیں۔

۴۔ باورچی خانے میں اہلِ خانہ کی مدد کرنا اور خود اچھے کھانے تیار کرنا۔

۵۔ جن چیزوں کو ڈاکٹر صاحب نے بطورِ ہنر سیکھا ان میں قالین بافی اور جواہرات شناسی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ وہ ان پیشوں سے وابستہ نہیں ہوئے لیکن باقاعدہ اساتذۂ فن سے ان کی تعلیم حاصل کی۔

۶۔ جن چیزوں کی حسرت رہی ان میں پتنگ بازی، تیراکی، عربی، پشتو اور سنسکرت زبان کی تعلیم قابلِ ذکر ہیں۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا آبائی شجرہ

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے سوانحی کوائف ایک نظر میں

نام: فضل میراں گوہر نوشاہی

قلمی نام: ڈاکٹر گوہر نوشاہی

ولدیت: الحاج مولانا محمد حیات نوشاہی

تاریخ ولادت: ۱۸ر جون ۱۹۳۹ء

جائے پیدائش: شرق پور، ضلع شیخوپورہ

مستقل پتا: ''الحیات''، نئی آبادی روڈ، بھارہ کہو، اسلام آباد

دفتر: نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

تعلیم: ایم اے (اُردو) ۱۹۶۵ء، پی ایچ ڈی (اُردو) ۱۹۸۴ء

ملازمت: مجموعی مدت ۳۳ سال

۱۔ لیکچرر شعبہ پنجابی، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، بطور رُکن شعبہ ادارت تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند، (گریڈ ۱۷) (مئی تا جون ۱۹۶۶ء)، ایک ماہ

۲۔ مدیر تالیفات مجلس ترقی ادب، لاہور، (گریڈ ۱۷/ ۱۸) (جون ۱۹۶۶ء تا فروری ۱۹۷۲ء)، ۵ سال ۸ ماہ

۳۔ ریسرچ سکالر، مشہد یونیورسٹی، مشہد ایران، با حق واپسی در مجلس ترقی ادب، لاہور، (مارچ ۱۹۷۲ء تا مارچ ۱۹۷۳ء)، ۱ سال ۲ ماہ

۴۔ استاد (پروفیسر) شعبہ اُردو پاکستان شناسی، مشہد یونیورسٹی مشہد، ایران، (اپریل ۱۹۷۳ء تا جون ۱۹۷۹ء)، ۶ سال ۲ ماہ

۵۔ لیکچرر پاکستان ایجوکیشنل سنٹر، دوحہ، (اپریل ۱۹۸۲ء تا مارچ ۱۹۸۵ء) ۳ سال

۶۔ معاون علمی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، (گریڈ ۱۸) (مارچ ۱۹۸۵ء تا دسمبر ۱۹۸۵ء)، ۹ ماہ

۷۔ نائب ناظم دارالتصنیف، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، (گریڈ ۱۹) (دسمبر ۱۹۸۵ء تا جون ۱۹۸۷ء)، ۱ سال ۶ ماہ

۸۔ نائب ناظم، شعبہ درسیات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، (گریڈ ۲۰) (جون ۱۹۸۷ء تا

فارسی زبان وادب کے سلسلے میں چند خدمات

تدریس: ذریعہ تدریس فارسی

○ پروفیسر (استاد) شعبہ اُردو پاکستان شناسی دانشکدہ ادبیات وعلوم انسانی، دانشگاہ مشہد، مشہد (ایران) (اپریل ۱۹۷۳ء تا جون ۱۹۷۹ء)۔ ۶ سال دو ماہ

تحقیقات

الف: فارسی مطبوعات

۱۔ ایران نامہ: مطبوعہ، بزم اقبال، لاہور۔

۲۔ شاہنامہ اُردو: مطبوعہ، رایزنی فرہنگی اسلامی، جمہوری ایران، اسلام آباد۔

۳۔ مقدمات زبان اُردو: فارسی زبانوں کے لیے اُردو کی درسی کتاب (غیر مطبوعہ): مشہد یونیورسٹی کے اُردو نصاب میں شامل ہے۔

۴۔ فعالیتھای فرہنگی مؤسسہ ھای خارجی دراسلام آباد (غیر مطبوعہ)

ب: فارسی مقالات

۱۔ احوال وآثار مولوی احمد بخش یکدل لاہوری، مطبوعہ مجلّہ دانشکدۂ ادبیات وعلوم انسانی، مشہد (ایران)۔ بعد میں یہ مقالہ تفصیل کے ساتھ مجلّہ دانش، اسلام آباد کے شمارہ نمبر ۲ میں شائع ہوا۔

۲۔ اقبال وحافظ، مطبوعہ مجلّہ دانشگاہِ فردوسی، دانشکدۂ ادبیات وعلوم انسانی، مشہد، شمارہ سوم، خزاں ۱۳۵۲ش۔

۳۔ حرفی چند در بارہ اقبال لاہوری: روزنامہ آفتاب شرق، مشہد، یہ مقالہ روزنامہ خراسان، مشہد میں بھی شائع ہوا۔

۴۔ اقبال شخص وشاعر: مشمولہ: آئینہ کمال، مرتبہ محمد حسین ساکت، مشہد، ایران۔

۵۔ دو نقش مہم در ترجمہ شاہنامہ بزبان اُردو: مطبوعہ مجلّہ دانش، اسلام آباد، شمارہ نمبر ۲۹، ۳۰۔

۶۔ استادارجمند دکتر وحید قریشی: مطبوعہ مجلہ دانش، اسلام آباد، شمارہ ۱۶۔

۷۔ البیرونی: مطبوعہ مجلّہ دانش، اسلام آباد، شمارہ نمبر ۲۲۔

۸۔ وارثہ ہای اُردو در آثار قدیم عربی: مطبوعہ مجلّہ دانش، شمارہ نمبر ۱۷-۱۸۔

۹۔ اقبال: شاعر نو آور و توانا، مطبوعہ مجلّہ پاکستان مصور، اسلام آباد۔

ج: اُردو مطبوعات

۱۔ **لاہور میں اُردو شاعری کی روایت**: مطبوعہ، مطبع عالیہ، لاہور۔

۲۔ **لاہور کے چشتی خاندان کی اُردو خدمات**: مقالہ برائے پی ایچ ڈی، مطبوعہ، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور۔

۳۔ **بیتال پچیسی (تحقیق و حواشی)**: مطبوعہ، مجلس ترقی ادب، لاہور۔

۴۔ **نتائج المعانی (تحقیق و حواشی)**: مطبوعہ، مجلس ترقی ادب، لاہور۔

۵۔ **مثنوی ہشت عدل (تحقیق و حواشی)**: مطبوعہ، مجلس ترقی ادب، لاہور۔

۶۔ **یادگار چشتی (تحقیق و حواشی)**: مطبوعہ، مجلس ترقی ادب، لاہور۔

۷۔ **مثنوی رمز العشق (تحقیق و حواشی)**: مطبوعہ، مجلس ترقی ادب، لاہور۔

۸۔ **مطالعہ اقبال (انتخاب و حواشی)**: بزم اقبال، لاہور۔

۹۔ **دیوانِ غالب (تحقیق و حواشی)**، نیشنل بک سینٹر، لاہور (**کتاب کا غالب نمبر**)، کتابی صورت میں سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔

۱۰۔ **مختصر قانونی اصطلاحات**: مطبوعہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔

۱۱۔ **مثنوی پدماوت اُردو (تحقیق و حواشی)**: مطبوعہ، مجلس ترقی ادب، لاہور۔

۱۲۔ **اُردو املا اور موز اوقاف**: مطبوعہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔

۱۳۔ **اُردو کی اہم دستاویزات**: مطبوعہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔

۱۴۔ **اُردو شاہنامہ**: مطبوعہ، رایزنی فرہنگی اسلامی جمہوری ایران، اسلام آباد۔

۱۵۔ **ڈاکٹر وحید قریشی...... سوانحی کتابیات**: مطبوعہ، المعارف، لاہور۔

۱۶۔ **مطالعۂ غالب**: مطبوعہ، مطبع عالیہ، لاہور۔

۱۷۔ **قطر میں اُردو**: مطبوعہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔

۱۸۔ **تحقیقی زاویے**: مطبوعہ، مجلس فروغ تحقیق، اسلام آباد۔

۱۹۔ **ادبی زاویے**: مطبوعہ، مجلس فروغ تحقیق، اسلام آباد۔

۲۰۔ **قیامِ پاکستان پر ایک محنت کش کا روزنامچہ**: مطبوعہ۔

۲۱۔ غالب کی خاندانی پنشن اور دیگر امور، مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد
۲۲۔ جائزہ زبان اُردو پنجاب: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔
۲۳۔ کتابیات وحید: المعارف، لاہور، طبع ثانی اضافوں کے ساتھ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد
۲۴۔ سیّد امتیاز علی تاج، شخصیت اور فن: اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد
۲۵۔ ڈاکٹر وحید قریشی، شخصیت اور فن: اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد

اُردو مقالات: (منتخب)

۱۔ اشرف فاروقی، مطبوعہ قومی زبان، کراچی، ۱۹۶۱ء
۲۔ غنیمت کنجاہی، مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین، لاہور، ۱۹۶۲ء
۳۔ اُسلوب، مطبوعہ صحیفہ، لاہور، ۱۹۶۵ء
۴۔ گنج الاسرار، مطبوعہ صحیفہ، لاہور، ۱۹۶۷ء
۵۔ اُردوئے معلّٰی کا میر تقی نمبر، مطبوعہ قومی زبان، کراچی ۱۹۶۷ء
۶۔ حضرت نوشہ گنج بخش، مطبوعہ گلِ خنداں، لاہور، ۱۹۶۶ء
۷۔ دیوان غالب نسخۂ شیرانی و نسخۂ عرشی کا تقابلی مطالعہ، مطبوعہ اقبال، لاہور ۱۹۶۹ء
۸۔ بیاد سیّد امتیاز علی تاج، مطبوعہ نقوش، لاہور، ۱۹۷۰ء
۹۔ واسوخت راحت، مطبوعہ قومی زبان، کراچی، ۱۹۶۸ء
۱۰۔ لکھنوی تہذیب اور فسانۂ آزاد، مشمولہ نقد سرشار مرتبہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری
۱۱۔ مثنوی ہشت عدالت، مطبوعہ سہ ماہی صحیفہ، لاہور، ۱۹۶۸ء
۱۲۔ کلام فگار، مطبوعہ صحیفہ، لاہور
۱۳۔ بریشم عود، مشمولہ بریشم عود، مجموعہ کلام سیّد عابد علی عابد
۱۴۔ حالی کلیات نثر میں، مطبوعہ کتاب، لاہور ۱۹۶۸ء
۱۵۔ جاوید شاہین کی غزل، مشمولہ آٹھ غزل گو، میری لائبریری، لاہور
۱۶۔ ریاض مجید کی دس غزلیں، مطبوعہ میری لائبریری، لاہور
۱۷۔ محمد افضل سرخوش، مطبوعہ کریسنٹ مجلہ اسلامیہ کالج، لاہور ۱۹۶۱ء

۱۸۔ نئی نظم کا مسئلہ، مطبوعہ فاران مجلہ اسلامیہ کالج، لاہور۔

۱۹۔ مثنوی کنز الرحمۃ، مطبوعہ ہفت روزہ چٹان، لاہور، ۱۹۶۲ء

۲۰۔ مثنوی تفنگ عشق، مطبوعہ ہفت روزہ لیل و نہار، لاہور، ۱۹۶۲ء۔

۲۱۔ ادبی تحقیق کے نئے اصول، مطبوعہ ہفت روزہ لیل و نہار، لاہور، ۱۹۶۲ء

۲۲۔ اشرف فاروقی کے ریختے، مطبوعہ ہفت روزہ لیل و نہار، لاہور، ۱۹۶۲ء۔

۲۳۔ شاہ حسین اور بیداری کا تجربہ، مطبوعہ روزنامہ امروز، لاہور، ۱۹۶۷ء (یہ مقالہ پنجابی زبان میں ماہنامہ پنجابی ادب، لاہور کی اشاعت ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا)

۲۴۔ قدرت کلام اور ندرت بیان کی شاعری، مطبوعہ ماہنامہ ادب لطیف، لاہور، ۱۹۶۷ء مشمولہ اب تک، حصہ اوّل، لاہور۔

۲۵۔ نیرنگ عشق کی شہرت و مقبولیت، مطبوعہ فاران مجلہ اسلامیہ کالج، لاہور، ۱۹۶۱ء

۲۶۔ ادیب نقاد اور ناشر، مطبوعہ ہفت روزہ اقدام، لاہور، ۱۹۶۲ء

۲۷۔ شعر اور شعور، حلقہ ارباب ذوق کی ایک نشست میں پڑھا گیا۔

۲۸۔ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح پر اُردو کی تدریس، مطبوعہ سفینہ، دوحہ (قطر)، ۱۹۸۳ء

۲۹۔ عربی زبان و ادب میں اقبال شناسی، مطبوعہ سفینہ، دوحہ (قطر)، ۱۹۸۴ء

۳۰۔ قطر میں اُردو، مطبوعہ اخبار اُردو مجلہ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء

۳۱۔ ذوق کی وفات پر نادر قطعات تاریخ، مجلہ ادبیات، اسلام آباد، شمارہ نمبر ۳

۳۲۔ پاکستان میں فارسی ادب پر ایک نظر، ششماہی مجلہ تاریخ و ثقافت، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء۔

۳۳۔ صوفیائے پنجاب اور سندھ کے باہمی روابط، مجلہ ادبیات، اسلام آباد

۳۴۔ واسع باری: سہ ماہی صحیفہ، لاہور، ۱۹۹۵ء۔

۳۵۔ جامع الاشعار: ایک گمنام تذکرہ، دریافت، شمارہ نمبر ا، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء۔

۳۶۔ پاکستان میں ادبی تحقیق، وسائل اور امکانات، دریافت، شمارہ نمبر ۲، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء

۳۷۔ پنجاب میں اُردو کا ایک ورق، دریافت، شمارہ نمبر ۳، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز،

اسلام آباد، ۲۰۰۴ء۔

۳۸۔ ژٹل نامہ کی ایک روایت، دریافت، شمارہ نمبر ۴، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء۔

۳۹۔ مثنوی سرِ مکنون، دریافت، شمارہ نمبر ۵، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء۔

۴۰۔ سوانح حضرت شاہ دولہ ایک معاصر دستاویز، دریافت، شمارہ نمبر ۷، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء۔

۴۱۔ میاں میر سندھی اور حضرت شاہ دولہ کے مشترک مقامات، الاقرباء، شمارہ نمبر ۳، اسلام آباد، جولائی ۲۰۰۵ء۔

۴۲۔ اُردو ہندی نزاع اور سر سیّد احمد خان، سہ ماہی نوادر، لاہور، فروری تا اپریل ۲۰۰۳ء۔

۴۳۔ فارسی زبان کے انحطاط کا اُردو زبان و ادب پر اثر، نوادر، شمارہ نمبر ۲۰، مجلس یادگار نظیر حسین زیدی، لاہور، ۲۰۰۷ء۔

اُردو سیمینار

۱۔ سیمینار اُردو میں اصول تحقیق، زیر اہتمام مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، منعقدہ شالیمار ہوٹل، راولپنڈی، ۲۵ تا ۲۷ر مارچ ۱۹۸۶ء۔

۲۔ سیمینار، اُردو میں فنی تدوین، زیر اہتمام ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد با اشتراک مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، منعقدہ شالیمار ہوٹل، راولپنڈی، ۲۴ تا ۲۶ر جون ۱۹۸۲ء۔

۳۔ اُردو کانفرنس خانیوال، زیر اہتمام ضلعی مجلس زبان دفتری خانیوال، منعقدہ خانیوال، ۱۴ر اپریل ۱۹۸۷ء۔

۴۔ شاہ عبداللطیف قومی کانفرنس، زیر اہتمام وزارت سیاحت و ثقافت، حکومت سندھ، منعقدہ پرل کونٹی نینٹل، کراچی، ۲۸، ۲۹ تا ۲۹ر مئی ۱۹۹۲ء۔

۵۔ شاہ ہمدان انٹرنیشنل کانفرنس بھوربن، وزیر اعظم پاکستان کے ہاتھوں سوئیر ملا۔

۶۔ مولانا محمد حسین آزاد بین الاقوامی سیمینار، گورنمنٹ یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۰ء۔

علمی و ادبی معاونت

درج ذیل مصنفین کے علمی کارناموں میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے معاونت کی۔ اس کا اعتراف درج ذیل تالیفات کے دیباچوں میں موجود ہے۔

۱۔ سیّد امتیاز علی تاج: اُردو کا کلاسیکی ڈرامہ۔ خورشید، آرام کے ڈرامے ودیگر۔

۲۔ پروفیسر حمید احمد خان: دیوانِ غالب نسخہ حمیدیہ۔

۳۔ خلیل الرحمٰن داؤدی: قصہ اگرگل۔

۴۔ انتظار حسین: انشاء کی دو کہانیاں۔

۵۔ نائب حسین نقوی: اُردو کی دو قدیم مثنویاں۔

۶۔ خالد نظیر صوفی: اقبال درونِ خانہ۔

پنجابی مطبوعات

۱۔ پنجابی شکوہ: پنجابی ادبی اکادمی، لاہور، ۱۹۶۸ء۔

۲۔ نقشِ خیال: ادارہ اُسلوب، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء۔

۳۔ نقشِ مونس: مقصود پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۹ء۔

تیسرا باب

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی تحقیقی خدمات

تحقیق ایک مشکل عمل ہے۔ اس میں بے شمار عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ انھی میں سے ایک محقق کا تاریخی شعور بھی ہے جس کے بغیر تحقیق نامکمل رہتی ہے۔ جب تک محقق کو کسی مصنف کے سوانح کا علم اور اس کے عہد کا شعور نہ ہو اُس وقت تک تحقیق کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ایک محقق میں نقد و نظر کی استعداد بھی ہونی چاہیے۔ ماہرینِ فنِ تحقیق کا خیال ہے کہ تحقیق، تنقید کے بغیر نامکمل ہے اور تنقید، تحقیق کے بغیر ادھوری ہوتی ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی بیک وقت محقق بھی ہیں اور نقاد بھی۔ وہ تحقیق و تنقید کے اس تعلق کو خوب سمجھتے ہیں، چنانچہ ڈاکٹر راشد حمید کو روزنامہ نوائے وقت میں انٹرویو دیتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں کہتے ہیں:

> ...... اگر محقق کو تنقید کا ذوق نہیں تو اس کا کام حقائق کی کھتونی یا فہرست بن جائے گا...... محقق کے لیے نقاد ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ کسی فن پارے کو پرکھنے کے لیے صرف سوانحی پہلو ہی نہیں ہوتے بلکہ اس کے جمالیاتی، نفسیاتی اور سیاسی پہلو بھی ہوتے ہیں۔ (۱)

تحقیق و تنقید ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ مصنف کی ذات و شخصیت کے گونا گوں مسائل سے ادب پارہ کسی نہ کسی طرح ضرور متاثر ہوتا ہے۔ کسی مصنف یا شاعر کی زندگی کوئی ایسی شے نہیں ہوتی جو خلا میں معلق ہو۔ شاعر یا مصنف بھی دوسرے انسانوں کی طرح اسی آب و گِل کا مکین ہوتا ہے اور معاشرے کے تہذیبی اور اجتماعی اثرات سے متاثر ہوتا ہے۔ (۲) کوئی مصنف اپنے گرد و پیش کے عوامل، متعلقات اور مادی قدروں سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اس کے علاوہ بہت ساری روایات اُنے ورثے میں ملتی ہیں جنھیں وہ آگے آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے

کا فریضہ انجام دے رہا ہوتا ہے۔ تنقید اگر کسی ادب پارے کے حسن و قبح پر بات کرتی ہے تو تحقیق اس ادب پارے کے ساتھ ساتھ اس کے عہد اور مصنف کے بارے میں درست معلومات فراہم کرتی ہے جس سے تنقید کئی مغالطوں سے محفوظ رہتی ہے۔ یعنی فن کے ساتھ ساتھ فنکار کو سمجھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ کسی فن پارے کی روح تک پہنچنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ جس ماحول اور جس زمانے میں وہ فن پارہ تخلیق کیا گیا اس زمانے اور ماحول کی مجموعی روح کو بھی سمجھا جائے تاکہ فن پارے کی تفہیم میں کسی قسم کا کوئی ابہام باقی نہ رہے۔ تحقیق کے عمل سے تنقید کے خدوخال اُجاگر کیے جاتے ہیں پھر تاریخ کو ادب کے حوالے سے آئینہ دکھایا جاتا ہے۔ جب ہم کسی ادب پارے کے حسن و قبح پر بات کرتے ہیں تو اس کی ''تاریخی واقعیت'' کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اور اگر ایسا کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم ادب پارے پر تنقید کا صحیح معنوں میں حق ادا نہیں کر رہے۔ یہاں یہ بات بہت اہم ہے کہ ''تاریخِ ادب'' صحیح معنوں میں ایک نقاد نہیں لکھ سکتا بلکہ محقق یہ کام بہتر طور پر انجام دے سکتا ہے۔ محقق اپنے تحقیقی مزاج اور شعور کی روشنی میں یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کوئی ادب پارہ تاریخِ ادب کا حصہ بن سکتا ہے یا نہیں۔ اس طرح محقق پر بہت ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یہاں تحقیق، تنقید سے ایک قدم آگے نظر آتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ محقق کی تاریخِ ادب سے وابستگی ہے۔ جب تک نقاد یا محقق تاریخِ ادب سے دلچسپی نہیں رکھتا، اس وقت تک نہ تو وہ کسی ادب پارے کے بارے میں کسی مضبوط رائے کا اظہار کر سکتا ہے اور نہ ہی تاریخِ ادب میں اس کے مناسب مقام و مرتبے کا تعین کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو ادب کے اوّلین ناقدین میں سے بیشتر ایسے تھے، جو ادب کے مؤرخ بھی تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ رقم طراز ہیں:

> اُردو میں ادب کے اوّلین نقاد بیشتر وہ بزرگ تھے جو ادب کے مورّخ تھے۔ مولانا آزاد مورّخ پہلے تھے نقاد بعد میں تھے، شبلی کی شعر العجم تاریخ کی کتاب پہلے ہے تنقید کی کتاب بعد میں ہے۔ حالی مقدمہ شعر و شاعری میں تو صرف ناقد کے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں، مگر حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید میں ان کی ناقدانہ حیثیت ضمنی ہے، سوانح نگارانہ حیثیت اصولی ہے۔ چنانچہ ان کتابوں میں امر واقعہ کی تحقیق ہی مقصود بالذات ہے۔ ان وجوہ سے کم و بیش پچاس سال تک تنقید اور تاریخ نگاری تقریباً باہم یک جان رہیں۔ اور امر واقعہ کی

تحقیق کا رجحان ہماری تنقید میں اس درجہ غالب رہا کہ اُردو کے پہلے نقاد محقق ہی کہلائے۔ پھر اعظم گڑھ کے مصنفین اور پروفیسر شیرانی وغیرہ نے تو ادبی مباحث سے متعلق مورّخانہ جستجو کو اس درجہ اپنی توجہ کا مرکز و محور بنالیا کہ ہمارے ملک میں مورّخانہ چھان بین ہی تحقیق کی بہترین اور مکمل ترین صورت قرار پائی۔ (۳)

جب مورّخانہ چھان بین ہی تحقیق کی بہترین صورت قرار پائی تو نتیجتاً نقادوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ تنقید کا جو مروّجہ انداز ہے اس کا جھکاؤ تو تاریخ اور تحقیق کی طرف زیادہ ہے۔ جس کے سبب ادب میں تنقید کا عنصر مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ اس سوچ کے پیشِ نظر تحقیق اور تنقید کو الگ الگ شعبے سمجھ لیا گیا۔ اب تحقیق اور تنقید الگ الگ شعبے ضرور ہیں لیکن ان کا بنیادی مقصد کسی حد تک ایک ہی ہے یعنی حقیقت کی تلاش۔ تحقیق بہت دقت طلب شعبہ ہے۔ اس پر تاریخ ادب کا دار و مدار ہوتا ہے۔ تحقیق میں تقلید نہیں ہوتی اور نہ ہی اندھا دھند اعتقاد سے کام چلتا ہے۔ تحقیق میں اندھا اعتقاد نہ صرف تحقیقی عمل کے لیے نقصان دہ ہے بلکہ اس کے راستے کی بہت بڑی رکاوٹ بھی ہے۔ محقق کو خوش اعتقاد ہونے کی بجائے متشکک مزاج ہونا چاہیے۔

تحقیق کی روایت ڈاکٹر گوہر نوشاہی کو اورینٹل کالج ایسی عظیم درس گاہ سے ملی۔ حافظ محمود شیرانی نے تحقیق کا ایک خاص ماحول پیدا کیا۔ اورینٹل کالج نے اس فن کی نہ صرف پاسداری کی بلکہ اُسے مزید نکھارنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اورینٹل کالج میں تحقیق کی روایت حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر محمد اقبال اور ڈاکٹر سیّد عبداللہ سے شروع ہوئی۔ ڈاکٹر وحید قریشی بھی اس روایت سے منسلک ہیں۔ یہ روایت ڈاکٹر وحید قریشی سے ڈاکٹر گوہر نوشاہی کو ملی۔ اسی تحقیقی روایت اور رویے کو دبستانِ لاہور کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی موضوعات کے اعتبار سے پراگندہ مزاج تھے، یہی بات ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی تحقیق میں ملتی ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی تحقیق کے حوالے سے ذہنی ساخت و پرداخت میں ڈاکٹر وحید قریشی کا بڑا ہاتھ ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی طرح ڈاکٹر گوہر نوشاہی بھی کسی ایک موضوع پر کام کرنا پسند نہیں کرتے۔ متنوع موضوعات پر اُن کا کام موجود ہے۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ تاریخِ ادب میں ان شاہپاروں پر کام کیا جائے جو دوسرے محققین کی نظر سے اوجھل رہے ہوں یا اپنا شایانِ شان مقام نہ پا سکے ہوں۔ اس مقصد میں وہ کافی حد تک کام یاب ہیں۔ دبستانِ لاہور کی تحقیقی روایت میں حزم واحتیاط شرطِ اوّلین ہے۔

یعنی ایک چیز کو بیان کرتے وقت جب تک اس کی سچائی کے بارے میں مکمل یقین نہ ہو جائے اس وقت تک اس کے بیان سے گریز کیا جاتا ہے۔ تحقیق میں بعض اوقات نارسائی کا سامنا بھی ہوتا ہے۔ کوئی نتیجہ حتمی تو نہیں ہوتا پھر بھی جہاں تک ممکن ہو اس کی سچائی تک پہنچنا ضروری ہوتا ہے۔ یہی حقیقت ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے پیشِ نظر رہی ہے۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی تحریروں میں تنقید کی نسبت تحقیق کا عمل زیادہ ہے۔ شروع میں ڈاکٹر صاحب کا رجحان شاعری کی طرف تھا۔ وہ مصرع کے وزن اور آہنگ کو سمجھتے ہیں۔ یہ خوبی ان کی نثر میں بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر خشک نہیں ہوتی۔ اس سے قاری کو اُکتاہٹ یا اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ نثر کی یہ بہت بڑی خوبی ہوتی ہے کہ گہری سے گہری علمی بات کو اس خوبصورتی سے پیش کیا جائے کہ پڑھنے والا حظ اٹھائے۔ ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر جمیل جالبی اور کلبِ علی خان فائق کی نثر کی کیفیت یہی ہے۔ ان کے یہاں بھی قرأت کی خوبی (Readability) کا عنصر ملتا ہے۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے سیّد عابد علی عابد اور سجاد باقر رضوی ایسے نقادوں سے بھی استفادہ کیا۔ ان بزرگوں کی رہنمائی میں ڈاکٹر صاحب نے نئے علوم سے آگاہی حاصل کی۔ نیا تنقیدی شعور اور قدیم و جدید ادب کا ادراک ان کی تحقیق میں بہت فائدہ مند ثابت ہوا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے تحقیق کے لیے نئے نئے موضوعات کا انتخاب کیا، اور ایسے موضوعات کو چھیڑا تک نہیں جس پر پہلے کام ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میر اور ولی پر ان کا کوئی کام موجود نہیں۔ ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ ایسے موضوعات پر کام کیا جائے جن سے اُردو ادب کی تاریخ میں اضافہ اور وسعت پیدا ہو۔ وہ ادب اور تصوف کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔ پنجاب کی تاریخ و تہذیب پر ان کی نظر وسیع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ڈاکٹریٹ کے لیے بالکل ایک نئے موضوع لاہور کے چشتی خاندان کی اُردو خدمات کو منتخب کیا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے تحقیقی کاموں کا جائزہ ان کی چند اہم تحقیقی کتب کے حوالے سے پیشِ خدمت ہے۔

ا۔۔۔ لاہور کے چشتی خاندان کی اُردو خدمات

لاہور کے چشتی خاندان کی اُردو خدمات ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ جس کے نگران ڈاکٹر وحید قریشی تھے۔ یہ مقالہ مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور سے دسمبر ۱۹۹۳ء میں

شائع ہوا۔ اور اس کا پیش لفظ محمد یوسف عباسی نے تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے خاندان میں تصوف اور ادب کی روایت زمانۂ قدیم سے چلی آ رہی تھی، جس کے پیشِ نظر انھوں نے چشتی خاندان کی اُردو خدمات کو موضوعِ تحقیق بنایا۔ اس موضوع کے انتخاب کی ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پنجاب میں چار بڑے خاندان ایسے تھے جن پر تحقیقی کام کی ضرورت تھی۔ مثلاً ایک بٹالے کا سیّد خاندان جس میں غلام شاہ بٹالوی، حضرت فاضل شاہ بٹالوی ایسے معتبر نام شامل، ہیں ان پر کوئی خاطر خواہ کام ابھی تک نہیں ہوا۔ دوسرا خاندان لاہور کا پیر خاندان تھا جس پر غلام دستگیر نامی کی ایک اہم کتاب تاریخ جلیلہ موجود ہے۔ پیر شاہ مراد لاہوری، سکندر شاہ لاہوری اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی بہت سی علمی و ادبی خدمات ہیں۔ تیسرا خاندان فقیروں کا خاندان تھا۔ فقیر مغیث الدین کے آباؤ اجداد غلام محی الدین نوشہ ثانی اور ان کے صاحبزادے جن میں فقیر نورالدین منور، فقیر عزیز الدین آزاد اور فقیر امام الدین شامل ہیں، ان کی فارسی و اُردو تصانیف قابلِ ذکر ہیں اور پنجاب کے ادب کا بہت اہم سرمایہ ہیں۔ چوتھا خاندان جس کی روایت مغلیہ دور کے آخر یا اس سے بھی پہلے موجود تھی وہ لاہور کا چشتی خاندان تھا۔ مغلیہ دور سے اس خاندان کے مورّخین، علما اور معلّمین کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ہمارے عہد تک جاری رہتا ہے۔ یہ کوئی پندرہ سولہ کے لگ بھگ مصنّفین ہیں جن کی یادگاریں، روزنامچے، شاعری کے دیوان اور اُردو فارسی تصانیف موجود ہیں۔ نیز صحافت میں بھی ان کا نام ملتا ہے۔

لاہور کے چشتی خاندان پر اُن کے تحقیقی سفر کی داستان خاصی طویل ہے۔ مولوی نور احمد چشتی کی تصنیف **تحقیقاتِ چشتی** کا مطالعہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے ۱۹۶۰ء میں کیا، جس کے بعد چشتی خاندان کے کارناموں کی عظمت ان کے دل و دماغ پر نقش ہو گئی اور بعد میں یہی چیز اُن کے پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھنے کا سبب ٹھہری۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی ڈاکٹر خالد سعید بٹ کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> سیّد امتیاز علی تاج نے فرمائش کی کہ اس خاندان کی تصنیف **یادگارِ چشتی** مرتب کر کے شائع کروں جو ایک مشکل کام تھا۔ اس کا نسخہ بھی مکمل نہیں تھا۔ جب تصحیح متن کا کام مکمل ہوا تو مجلس ترقیِ ادب کی روایت کے مطابق مفصّل مقدمہ لکھنے کی نوبت آئی تو معلوم ہوا کہ اس خاندان کے بارے میں کوئی بھی چیز میسر نہیں ہے

> چنانچہ مختلف ذرائع سے مواد اکٹھا کر کے تین سال صَرف کر کے کتاب کا مقدمہ مکمل کیا۔ اس تحقیقی کام میں دوستوں نے میری غیر معمولی حوصلہ افزائی کی، لہٰذا اس کو بنیاد بنا کر میں نے یہ سوچا کہ اس کام کو اور آگے بڑھانا چاہیے اس لیے میں نے یہ موضوع پی ایچ۔ڈی کے مقالہ کے لیے منتخب کیا۔ (۴)

یہ مقالہ چھ ابواب اور چند ضمیموں پر مشتمل ہے۔ اس مقالے کے پہلے باب میں اٹھارویں صدی سے انیسویں صدی کے وسط تک پنجاب کے سیاسی، تاریخی اور تمدنی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ حالات اس خاندان کے اہلِ علم بزرگوں کی لکھی ہوئی ڈائریوں اور روز ناموں میں درج ہیں۔ چشتی خاندان کے دور میں اِس خطے کی سیاسی صورتِ حال انتہائی ابتر تھی۔ مغلوں کی حکومت کمزور ہو چکی تھی، احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ کے پے در پے حملوں نے پنجاب کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا تھا۔ یہاں کی سیاسی، تمدنی اور تہذیبی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ مسلمانوں کی حکومت کا سورج ڈوب رہا تھا اور دوسری قومیں سر اٹھا رہی تھیں۔ مرکز کمزور ہونے کی وجہ سے باہر سے آنے والے حملہ آوروں کی راہ ہموار ہو گئی تھی۔ اُن حملہ آوروں کو موقع مل گیا کہ وہ پنجاب کو اپنے غیظ وغضب کا نشانہ بنائیں۔ ایک دور میں ہندوستان کو سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا۔ یہ خطہ بڑا زرخیز تھا، اکثر حملہ آوروں کی اس خطے پر نظر رہتی تھی۔ یہاں مادّی وسائل بہت زیادہ تھے۔ یہی مادّی وسائل اِس خطے کی بدنصیبی کا سبب بنے۔ حملہ آور افغانستان اور ایران سے آتے اور مال اسباب لوٹ کر واپس چلے جاتے۔ بظاہر یہ جنگیں اسلام کی خاطر لڑی گئیں لیکن یہ صورتِ حال خاصی مشکوک نظر آتی ہے، ایسا لگتا ہے کہ اکثر جنگیں تاوان اکٹھا کرنے کے لیے لڑی گئی تھیں۔

لاہور میں نادر شاہ نے نواب زکریا خان سے اتنا بھاری تاوان وصول کیا کہ اس کی حکومت مالی طور پر دیوالیہ ہو گئی۔ جب افغان بادشاہ شاہ زمان یہاں خون خرابہ کر کے واپس گیا تو لاہور انتہائی کسمپرسی کے عالم میں تھا۔ لاہور میں ہر طرف انسانی مردہ لاشوں کے ڈھیر نظر آئے۔ ہر طرف انسانی جسموں کے چیتھڑے بکھرے ہوئے تھے جو چیلوں اور کوؤں کی خوراک بنے۔ انسانی جسم گندگی کا ڈھیر بن گئے، ہر طرف بدبو پھیل گئی، بہت روح فرسا ماحول تھا۔ کون سی آنکھ تھی جو اِن حالات پر اشکبار نہ ہوئی ہوگی۔ گندگی کی وجہ سے لاہور پر مکھیوں کا حملہ ہوا جس پر شاہ مراد لاہوری نے ایک نظم ''مگس نامہ'' کے عنوان سے لکھی۔ اس نظم میں اس منظر کی خوب عکاسی کی گئی ہے۔ ان

جنگوں کا بڑا نقصان یہ ہوا کہ مسلمانوں پر سکھوں کے مظالم شروع ہو گئے۔ وہ جو کبھی مسلمانوں کے خلاف سوچ تک نہیں سکتے تھے اب بغاوت پر اُتر آئے۔ انھوں نے مسلمانوں کے خلاف منصوبہ بندی کی۔ آہستہ آہستہ سکھ گردی اور لوٹ مار میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ مسلمان بادشاہ دلّی میں خاموش بیٹھے سب کچھ دیکھتے رہے اور پنجاب تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا۔ اس پس منظر میں رنجیت سنگھ کی حکومت قائم ہوئی۔ یہ سارے حالات چشتی خاندان کے بزرگوں کے لکھے ہوئے روزنامچوں اور ڈائریوں میں موجود ہیں۔ وہ جو دیکھتے اُسے اسی طرح لکھ دیتے۔ انھوں نے سکھوں کو ''زانو برہنہ'' اور ''جھٹکا خور'' کے القابات سے یاد کیا ہے۔ چشتی خاندان کے بزرگوں کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی ڈائریاں اور روزنامچے لکھنے شروع کر دیے۔ اس طرح ایک رسم سی چل نکلی اور لکھنے والوں کا ایک قافلہ تیار ہو گیا۔

رنجیت سنگھ کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ اس نے گوجرانوالہ میں مولوی نظام الدین سے فارسی سیکھی۔ اُسے تاریخ سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ ہر وقت دوسرے ملکوں کے حالات جاننے کی جستجو میں رہتا۔ جب کوئی باہر سے مسافر پنجاب آتا تو رنجیت سنگھ اس سے اس کے ملک کے حالات پوچھتا، بادشاہوں کے بارے میں معلومات لیتا، وہاں کے رسم و رواج اور عوام کی پسند ناپسند کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا۔ اس کے اس شوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے عوام میں علمی اور تاریخی شعور پیدا ہو گیا۔ سکالرز کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ بہت سے لوگوں نے روزنامچے اور تاریخیں لکھنا شروع کر دیں۔ رنجیت سنگھ کی تاریخ سے دلچسپی کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ اس نے سوہن لعل سوری سے عمدۃ التواریخ لکھوائی اور اُسے انگلستان بھیجا۔ تاریخ نویسی کے علاوہ بھی اس دور میں بہت کام ہوا مثلاً عبرت نامہ مصنفہ مفتی علی الدین، تاریخ پنجاب از سیّد احمد شاہ بٹالوی اِسی زمانے کی یادگاریں ہیں۔ اس کے بعد والی کھیپ نے فارسی سے ہٹ کر اُردو میں تاریخ لکھنے کا رواج ڈالا۔ اس سلسلے میں مفتی غلام سرور کا کام بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ سکھ دور میں جتنی بھی تاریخیں لکھی گئیں اُن پر کسی نہ کسی طرح چشتی خاندان کا اثر ضرور موجود ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کہتے ہیں:

> سوہن لعل سوری کے اس (چشتی) خاندان سے گہرے مراسم تھے۔ امرناتھ اکبری، ظفر نامہ رنجیت سنگھ والے مولوی احمد بخش کے شاگرد تھے اور مولوی نور احمد

> چشتی کے استاد بھائی تھے۔ عبرت نامہ کے مصنف علی الدین بن خیر الدین، مولوی نور احمد چشتی کے خالو تھے اور مولوی احمد بخش کے ہم زلف...... یہ سارا خاندان علمی و ادبی منظر نامے پر ایک تحریک کی صورت میں ہمیں انیسویں صدی میں نظر آتا ہے اور اس تحریک نے آگے چل کر ہمارے ادب کو اور علمی موضوعات کو بہت فروغ دیا۔ (۵)

دوسرا باب چشتی خاندان کے معاصر علمی و ادبی ماحول سے متعلق ہے۔ جب تک کسی نثر پارہ کو اس ماحول میں رکھ کر نہ پرکھا جائے جس میں وہ لکھا گیا ہو تو اس وقت تک اس کے معیار پر بات نہیں کی جاسکتی۔ بالکل اسی طرح کسی مصنف یا ادیب پر یا اس کے کام پر بات کرنے سے پہلے اس کے معاصر ادبی ماحول کو جاننا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اسی نقطۂ نظر کے پیشِ نظر ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اس مقالے کے دوسرے باب میں اُس ماحول پر روشنی ڈالی ہے کہ اس وقت چشتی خاندان کے علاوہ اور کون کون سے لوگ تھے جو علمی و ادبی کاموں میں مصروف تھے۔ اس خاندان کے مصنفین کن کن لوگوں سے متاثر ہوئے اور ان کے علمی و ادبی کام کا کن لوگوں پر اثر پڑا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ جائزہ بھی لیا گیا ہے کہ جس دور میں چشتی خاندان تصانیف و تالیف میں مصروف تھا اُس وقت صحافت کس انداز سے اپنے فرائض انجام دے رہی تھی یعنی اُس وقت معاصر اخبارات و رسائل کی صورتِ حال کیا تھی۔ اس وقت علمی ادبی تصانیف کا سامنے لانا کتنے امکانات سمیٹے ہوئے تھا۔ اس باب کا آخری حصہ شاعری اور نثر کے حوالے سے ہے۔ یہ خالصتاً مصنف کے ادبی نقطۂ نظر کو پیش کرتا ہے۔

تیسرا باب چشتی خاندان کے تعارف سے متعلق ہے۔ اس میں چشتی خاندن کے سوانحی حقائق کو سامنے لایا گیا ہے کہ اُن کے مورثِ اعلیٰ کون تھے، مختلف زمانوں میں علمی و ادبی حوالے سے انھوں نے کیا کیا کارنامے سرانجام دیے، ادب اور سیاست میں اس خاندان کا کیا مقام و مرتبہ تھا۔ چوتھا باب چشتی خاندان کے اہم اہلِ قلم کے حالات اور اُن کی کاوشوں کی تفصیل پر مشتمل ہے۔ اس باب کا آغاز مولوی ضیاء الحق چشتی سے کیا گیا ہے۔ جب نادر شاہ درّانی نے لاہور پر حملہ کیا اس وقت مولوی ضیاء الحق چشتی، چشتی خاندان کی سرپرستی کر رہے تھے۔ جب نادر شاہ غیظ و غضب کی حالت میں لاہور آیا اور شالامار باغ میں اپنا پڑاؤ ڈالا تو اس وقت کے گورنر نے مولوی

ضیاء الحق چشتی کو اعلیٰ پائے کے سکالر کے طور پر نادر شاہ کے سامنے پیش کیا۔ موصوف نے نادر شاہ سے کچھ اس انداز سے گفتگو کی کہ اس کے غصے میں کمی آ گئی اور لاہور کے بارے میں اس کا رویہ قدرے نرم سا ہو گیا۔ ضیاء الحق چشتی کے بعد اس باب میں مولوی محمد ابراہیم چشتی اور ان کے بیٹے غلام حسین چشتی کا ذکر ہے۔ اس کے بعد اس خاندان کے صحیح علمی وارث مولوی احمد بخش یکدل کا ذکر کیا گیا ہے جس نے اپنے علمی کارناموں سے پوری صدی کو متاثر کیا۔ مولوی احمد بخش پنجاب کے رہنے والے تھے۔ بچپن میں یتیم ہو گئے تھے۔ انھوں نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں مہاراجہ کی فتح کے لیے خط لکھا کہ مہاراجہ نے ملتان فتح کر لیا ہے۔ اس خط کی نثر اتنی دلکش اور دل فریب تھی کہ اس کی دھوم دور دور تک پھیل گئی۔ مہاراجہ نے انھیں دربار میں بلایا اور وزیرِ معارف بنانے کی پیش کش کی۔ اس پر مولوی صاحب نے والدہ سے اجازت چاہی تو والدہ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ تیرے باپ دادا کا پیشہ استاد ہونا ہے کسی کا نوکر ہونا نہیں، مہاراجہ سے معذرت کر لو۔ اس پر مولوی صاحب نے مہاراجہ سے کہا کہ میری والدہ نے نصیحت کی ہے کہ میں بحیثیت مدرّس اور سکالر کے زندگی گزاروں۔ جس پر مہاراجہ بہت خوش ہوئے۔ مولوی صاحب کو جاگیر عطا کی اور کہا کہ میں اس جذبے کی قدر کرتا ہوں۔

مہاراجہ جب تک زندہ رہے مولوی صاحب کی حیثیت کسی وزیر سے کم نہ ہونے دی۔ اس وقت پنجاب کا سارا تدریسی نظام مسلمان ہی چلاتے تھے اور اس تدریسی نظام کا مرکز مولوی یکدل اور ان کے آباؤ اجداد کو مانا جاتا تھا۔ والد کی وفات کے بعد تدریس کا فریضہ انھوں نے خود سنبھال لیا۔ اس وقت مہاراجوں کے بچے اور دوسرے لوگوں کے بچے جو شاہی ملازمتوں میں دلچسپی رکھتے تھے، مولوی صاحب کے پاس آنے لگے۔ مہاراجہ نے اس وقت فارسی کو سرکاری زبان کا درجہ دے رکھا تھا۔ اس وقت جو شخص زیادہ فارسی جانتا تھا اُسے ہی شاہی دربار میں کوئی منصب حاصل ہو سکتا تھا۔ اس وقت سکالر ہی ڈگری دیتا تھا۔ وہ یہ لکھ کر دیتا کہ فلاں شخص پڑھا لکھا ہے۔ اس سلسلے میں مولوی صاحب کو ایک ادارے کی حیثیت حاصل تھی۔ اس وقت کے اہم وزرا اور امرا مولوی احمد بخش یکدل ہی کے شاگرد تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ جو غیر سرکاری عہدے حاصل کرنا چاہتے تھے وہ بھی مولوی صاحب اور ان کے خاندان ہی سے فیض یاب ہوتے تھے۔ ۱۸۴۶ء میں پنجاب انگریزوں کے زیرِ تسلط آ گیا۔ تقریباً تین سال کے بعد پنجاب کو مستقل الحاق میں لے لیا گیا۔

انیسویں صدی کے تقریباً آخری چالیس پچاس برسوں میں انگریزی مدرسوں میں اُردو پڑھانے والے معلّمین میں سے اکثر کا تعلق خاندانِ چشتی ہی سے تھا۔ یہ قریب قریب ۱۸۴۹ء سے ۱۹۰۰ء تک کا زمانہ بنتا ہے۔ اس دور میں چشتی خاندان کے لوگوں نے اُردو زبان کو کسی نہ کسی طرح زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ بہت سے مقامی باشندوں کے ساتھ ساتھ انگریزوں کو بھی اُردو سکھائی، حتیٰ کہ لارڈ لارنس نے بھی مولوی نور احمد چشتی کی شاگردی اختیار کی۔

پانچویں باب میں چشتی خاندان کی اہم اُردو تصانیف کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی اِن تصانیف پر تنقید اور تبصرے بھی کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے بڑی محنت اور جانفشانی سے ان کی تصانیف کو تلاش کیا۔ ان کی بازیابی واقعی بہت مشکل کام تھا، جسے انھوں نے بخوبی انجام دیا۔ انھوں نے ان تصانیف کی بازیابی کے بعد اس سلیقے سے تنقید و تبصرے کیے کہ اُن کی قدر و قیمت میں ایک دم اضافہ ہو گیا۔

چھٹا اور آخری باب چشتی خاندان کے ادبی و تہذیبی اثرات کے حوالے سے ہے۔ اس باب میں اس بات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ چشتی خاندان کی تدریسی اور ادبی کاوشوں نے اس دور پر کیا اثرات چھوڑے۔ چشتی خاندان کی اُردو خدمات کا اگر بغور مطالعہ کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ سوانح، تاریخ، ادب اور ثقافت اس کتاب کے نمایاں عناصر ہیں۔ ان سب عناصر کو خوب صورتی سے اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب لاہور کی ثقافتی زندگی کی ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ مسلمانوں کی درماندگی اور پس ماندگی کے دور کی عکاسی کرتی ہے۔ اس میں تاریخ کو سوانح کے پس منظر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ دراصل سوانح اور تاریخ دونوں ملتی جلتی چیزیں ہیں، دونوں کے گڈمڈ ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اگر سوانح سے شخصی عنصر خارج کر دیا جائے تو یہ شجرۂ نسب کے قریب قریب کی کوئی چیز بن جائے گی۔ سوانح اور شجرۂ نسب میں کوئی زیادہ فرق نہیں رہے گا۔ گوہر نوشاہی نے اس لطیف سے فرق کو سمجھا ہے اور احتیاط سے سوانح نگاری اور تحقیق کے تقاضوں کو نبھایا ہے یہاں انھوں نے تحقیق و ژرف نگاہی کا حق ادا کر دیا ہے اور تاریخ اور سوانح نگاری کے معیارات پر پورے اترے ہیں۔ چشتی خاندان کی اُردو خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سفیر اختر لکھتے ہیں:

جناب گوہر نوشاہی کو اس خانوادے کے موجود علمی سرمائے تک رسائی حاصل رہی ہے۔ تمام اہم تاریخی و تمدنی ماخذوں پر ان کی نظر ہے اور اُن کے ذاتی ذوق تجزیہ و

تحقیق نے معلومات کو ایک عمدہ تحقیقی مقالے کی شکل میں ڈھال دیا ہے۔ بلاشبہ، لاہور کے چشتی خاندان کی اُردو خدمات کا بنیادی حوالہ تاریخ ادب اُردو کا ہے، تاہم تاریخ و تذکرہ اور تہذیب و تمدن کی پیش رفت سے بھی اس کتاب کی بھرپور اہمیت ہے۔(۶)

ڈاکٹر یوسف عباسی اپنے تجزیے میں لکھتے ہیں:

چشتی خاندان کی سوا دو سو سالہ تاریخ میں یکے بعد دیگرے کئی اہلِ علم، شاعر، ادیب اور مورّخ پیدا ہوئے۔ ان کے ادبی کارنامے اس کتاب کا موضوع ہیں۔ مختلف شخصیات کی بوقلموں خصوصیات کا موازنہ اور محاکمہ کرتے وقت تحقیق کا پورا حق ادا کیا گیا ہے اور ایسے نادر مخطوطات سے استفادہ کیا گیا ہے جو بیشتر ریسرچ سکالروں کی نظر سے اوجھل ہیں۔(۷)

جب یہ کتاب پی ایچ. ڈی کے مقالے کے طور پر پیش کی گئی تھی تو ممتحن کی حیثیت سے ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے اس مقالے پر اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا:

مقالے کی ترتیب اچھی ہے اور مقالہ نگار نے اپنی کہی ہوئی ہر بات کے لیے شواہد و اسناد پیش کیے ہیں۔ مقالے میں خاصا مواد ایسا ہے جو پہلی بار سامنے آیا اور نئی دریافت کی حیثیت رکھتا ہے۔ مقالہ نگار کی تحقیقی کاوش قابلِ داد ہے۔(۸)

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے مطابق:

ڈاکٹر گوہر نوشاہی بہت پختہ مشق مصنف ہیں اور خوش قسمتی سے وہ ایسے خاندان کے چشم و چراغ ہیں جس کے تقدس میں کوئی شک نہیں۔ اس خاندان کے اور خود گوہر نوشاہی کے پاس ایسے قلمی نسخے، قلمی بیاضیں اور روزنامچے موجود ہیں جو دوسرے کسی کتب خانے میں نہیں ہیں۔ محترم نے یہ مقالہ لکھ کر ہماری علمی اور تاریخی معلومات میں اضافہ کیا ہے اور بکثرت نئے ماخذوں کی نشاندہی کی ہے۔(۹)

ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے استاد ہیں۔ لاہور کے چشتی خاندان کی اُردو خدمات پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اُردو ادب کی تاریخ کے ایک غیر معلوم گوشے کو منور کرنے میں نوشاہی صاحب نے جو محنت اٹھائی ہے وہ قابلِ داد ہے۔ پنجاب میں اُردو ادب کی تاریخ اس تحقیقی مواد سے ایک نئے زاویے سے ہمارے سامنے آئی ہے۔ یہ مقالہ اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے اتنا وقیع ہے کہ میں اس اہم کارنامے پر عزیز موصوف کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ (۱۰)

ڈاکٹر وحید قریشی ''ڈاکٹر گوہر نوشاہی سوانح اور علمی خدمات'' کے موضوع پر لکھے گئے مقالے پر تہمینہ نذیر کو دیے گئے ایک انٹرویو میں لکھتے ہیں:

> میرے نزدیک پنجاب کا ابتدائی زمانہ تاریکی میں ہے، ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اس کے بہت بڑے گوشے کو نمایاں کیا ہے۔ چشتی خاندان کی فارسی، اُردو اور تاریخ نویسی میں اہم خدمات ہیں۔ انھوں نے اس دور کے سلسلے میں جو کام کیا ہے اور ہمارے ادب کے ایسے گوشے پر روشنی ڈالی ہے جو اب تک تاریخِ ادب لکھنے والوں کی نظر میں نہ تھا۔ (۱۱)

زیرِ نظر کتاب میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی سے کُچھ فروگزاشتیں بھی سرزد ہوئی ہیں جن کی نشان دہی ڈاکٹر سفیر اختر نے بھی کی ہے۔ مثال کے طور پر مولوی محمد ابراہیم علی چشتی کے کارنامۂ حیات کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا تبصرہ ''غیر جانب دارانہ'' سے زیادہ ''مداحانہ'' ہے۔ مولوی ابراہیم علی چشتی ایک طرف تو آل انڈیا مسلم لیگ کی حامی طلبہ تنظیم ''مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن'' میں متحرک رہے اور دوسری طرف ۱۹۴۶ء میں وہ مسلم لیگ مخالف یونینسٹ پارٹی کی رہنمائی کرتے رہے۔ نہ صرف اتنا بلکہ وزیرِ اعلیٰ پنجاب خضر حیات ٹوانہ کی سرکردگی میں قائم ''تحریکِ خلافت'' کے پروونشل سیکرٹری کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ مولوی ابراہیم علی چشتی کی شخصیت میں موجود اِن تمام تضادات سے چشم پوشی کرتے ہوئے ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے ان کی مدح سرائی کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں: تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں مولوی محمد ابراہیم کی خدمات پاکستان شناسوں سے پوشیدہ نہیں۔ (ص ۲۰۹)

اس کے علاوہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے امرناتھ اکبری کے بارے میں لکھا کہ ان کے حالات شاگردانِ یکدل کے تحت درج کیے جائیں گے اور وہیں ان کی شاعری کو زیرِ بحث لایا جائے گا

(ص ۱۰۸)۔ ''ان کے علمی وادبی کارہائے نمایاں آئندہ ابواب میں تفصیل سے زیرِ بحث آئیں گے۔'' (ص ۱۴۱)۔ مگر عملی طور ایسا نہیں کیا گیا۔ امرناتھ اکبری کا ذکر صفحات ۲۸۰ اور ۲۸۱ میں لے دے کے کل ایک صفحے میں ہی نمٹا دیا گیا ہے۔ اسی طرح صفحہ ۳۷۲ پر یکدل کی نعت کے دو بند نقل کیے گئے ہیں اور لکھا گیا ہے کہ پوری نعت ضمیمے میں موجود ہے۔ مگر نعت پر مشتمل کوئی ضمیمہ شاملِ کتاب نہیں۔ (۱۲)

۲۔ تحقیقی زاویے

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی کتاب تحقیقی زاویے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب کے چند مفصّل مقالات شامل ہیں جو وقتاً فوقتاً مختلف ادبی رسائل و جرائد میں چھپتے رہے۔ اِن رسائل اور جرائد میں اورینٹل کالج میگزین، صحیفہ اور ادبیات اکیڈمی کے رسالے قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں بہت سارے مقالات ان کی کتابوں کے مقدمے ہیں، خاص کر اُن کتب کے جو مجلس ترقی ادب نے شائع کیں، مجلس ترقی ادب میں متن کی تصحیح اور تدوین کے ساتھ کتاب اور کتاب کے مصنف پر تحقیقی کام کروایا جاتا تھا۔ مجلس ترقی ادب کا یہ خاص مزاج تھا کہ وہ پہلے متن کی تصحیح کی طرف توجہ دیتی، جب تصحیح متن کا مرحلہ مکمل ہو جاتا تو کتاب کے مصنف پر تحقیقی کام کرواتی۔ تحقیقی زاویے میں مجلس ترقی ادب کی طرف سے شائع کردہ کتابوں اور اس کے علاوہ دوسری مختلف جگہوں سے چھپی ہوئی کتابوں کے مقدمے شامل ہیں۔ یہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی پچیس سالہ محنت کا ثمر ہے۔ زیرِ نظر کتاب کا انتساب ادارہ مجلس ترقی ادب، لاہور کے نام کیا گیا ہے۔ اور اس کا پیش لفظ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تحریر کیا ہے۔ اس پیش لفظ میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے تحقیقی مزاج، ان کی علم وادب سے دلچسپی اور ان کی کتاب تحقیقی زاویے پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> علم وادب اُن کا اوڑھنا بچھونا ہے...... اُردو کے شیدائی قدیم ادب کے پارکھ، پنجاب کی دنیائے علم وادب کے راز دان، قدیم کتابوں کے رسیا اور ہر اُس شخص کے دوست جس کے پاس پرانی کتابیں، پرانے رسائل و جرائد اور مخطوطات ہوں...... علم و تحقیق کے آدمی ہیں اور تحقیق میں تدوینِ متن ان کا اصل میدان ہے۔ انھوں نے کئی نایاب کتابوں کا کھوج لگا کر انھیں سلیقے سے مرتّب اور شائع

کیا ہے...... اُن کی تحقیق میں عرق ریزی بھی ملتی ہے اور بات کی تہ تک پہنچنے اور سچائی کے موتی تلاش کرنے کا حوصلہ بھی...... تحقیقی زاویے ایک ایسی کتاب ہے جسے ہر اُس شخص کو پڑھنا چاہیے جو اُردو زبان وادب کے گہرے مطالعے سے دلچسپی رکھتا ہو۔ (۱۳)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اس کتاب کو چار حصوں (ا۔ب۔ج۔د) میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے (الف) کا عنوان کلاسیکی ادب ہے۔ اس میں سات تحقیقی مضامین شامل ہیں جن کے موضوعات درج ذیل ہیں:

۱۔ بیتال پچیسی	۲۔ نتائج المعانی
۳۔ مثنوی ہشت عدل	۴۔ یادگارِ چشتی
۵۔ پدماوتِ اُردو	۶۔ قصہ خسروانِ عجم

پہلا مقالہ بیتال پچیسی پر ہے جسے مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور نے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا تھا۔ بیتال پچیسی ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا مجلس کے لیے پہلا مدوّن کیا ہوا متن تھا۔ اس کتاب کے دوسرے مقالے کا عنوان نتائج المعانی ہے۔ یہ مقالہ نتائج المعانی مصنفہ محمود بیگ راحت کا مقدمہ ہے۔ اس کتاب کو بھی مجلسِ ترقیِ ادب نے شائع کیا تھا۔ نتائج المعانی کے مصنف آغا محمود بیگ راحت کے بارے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی کو کسی تذکرہ یا کسی بیرونی ماخذ سے مکمل معلومات نہیں مل سکیں البتہ کتاب کے متن میں ایسی شہادتیں ضرور موجود تھیں جن کی مدد سے آغا محمود بیگ راحت کی زندگی سے متعلق ایک جامع خاکہ مرتب کیا جاسکتا تھا۔ نتائج المعانی کا مقدمہ لکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کتاب کی اندرونی شہادتوں سے استفادہ کیا ہے اور مقدمے کا خاکہ کتاب کے مختلف مطالب سے تیار کیا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد کام ہے۔ تیسرا مقالہ مثنوی ہشت عدل پر ہے۔ اِسے بھی کتابی صورت میں مجلسِ ترقیِ ادب نے شائع کیا تھا۔ اس مقالے میں جو ہشت عدل کا مقدمہ ہے، آغا محمود بیگ راحت کے تفصیلی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد مثنوی رمز العشق پر لکھا گیا مقالہ شامل ہے۔ دراصل یہ مقالہ بھی مطبوعہ مثنوی کا مقدمہ ہی ہے البتہ اس مقالے کے ساتھ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے مثنوی کا متن بھی شامل کردیا ہے۔ یہ متن ڈاکٹر صاحب نے مثنوی کے پانچ قلمی نسخوں کی مدد سے تیار کیا تھا۔ یہ پانچوں قلمی نسخے پنجاب یونیورسٹی کے ذخیرۂ شیرانی میں

موجود ہیں۔اس کے بعد یادگارِ چشتی کے عنوان سے مقالہ شامل کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ بھی یادگارِ چشتی کا مقدمہ ہے۔ یہ مقدمہ ان کے تمام تحقیقی کاموں میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔اس کے بعد پدماوتِ اُردو کا مقدمہ شامل کیا گیا ہے۔ پدماوتِ اُردو کا مقدمہ تنقیدی نوعیت کا مقدمہ ہے اس میں مصنف کے اُسلوب کو کریدنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنف کے کام کو کئی زاویوں سے پرکھا گیا ہے۔ پدماوتِ اُردو کے بعد ''قصہ خسروانِ عجم'' کے عنوان سے مضمون شامل کیا گیا ہے ''قصہ خسروانِ عجم'' کو شاہنامہ فردوسی کے ہزار سالہ جشن پر مرتب کیا گیا تھا۔

اِن مقالات میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی بحیثیت محقق ابھر کر سامنے آئے ہیں۔اُن کے تحقیقی اُسلوب کے بہت سارے پہلو، جو اب تک ہماری نظروں سے اوجھل تھے، سامنے آگئے ہیں۔ انھوں نے تحقیق کے مروّجہ اصولوں سے انحراف نہیں کیا۔ انھوں نے تحقیق کے مروّجہ اصولوں کی محض پیروی ہی نہیں کی بلکہ ان میں خاطر خواہ اضافہ بھی کر دیا ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے تحقیقی زاویے میں مختلف متون پر لکھے گئے مقدمے، جو بکھرے پڑے تھے، انھیں ایک جگہ پر اکٹھا کر دیا ہے، جسے محققین نے بہت پسند کیا۔ بعد میں اس طرز پر دوسرے بڑے بڑے محققین نے بھی اپنے اپنے مختلف مضامین کو کتابی صورتوں میں ڈھال دیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی متفرق کتابوں پر مقدمات مقالاتِ تحقیق کے نام سے مرتب کیے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے مقدموں کا مجموعہ ادبی تحقیق کے نام سے مرتب کیا۔ مشفق خواجہ نے اس نوعیت کا کام تحقیق نامہ کے عنوان سے مرتب کیا۔ ڈاکٹر مزمل حسین نے اپنے متفرق تحقیقی و تنقیدی مضامین کو نئے زاویے اور لطافت اُسلوب کے ناموں سے مرتب کیا۔ اس طرز کے کام کو بھارت میں بھی پذیرائی ملی۔ ڈاکٹر گیان چند نے پاکستان میں اُردو تحقیق پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ایک جگہ تحقیقی زاویے، تحقیق نامہ اور ادبی تحقیق کو سراہا ہے۔ غرضیکہ تحقیقی زاویے محققین کی نگاہ میں بہت قدر و قیمت کی حامل کتاب ہے۔اس سلسلے میں رفاقت علی شاہد لکھتے ہیں:

> ان مقالات میں نتائج المعانی، ہشت عدل، رمز العشق، یادگارِ چشتی یقیناً اب بھی اپنی تحقیقات کے پیشِ نظر مستند ہیں اور تا حال اِن تحقیقات میں اضافہ نہیں ہو سکا، پدماوتِ اُردو بنیادی طور پر تنقیدی مضمون ہے۔ بیتال پچیسی اور پدماوتِ اُردو البتہ ایسے موضوعات ہیں جن پر ان کی مزید توجہ کی ضرورت ہے۔ نتائج المعانی

اور مثنوی ہشت عدل کے مصنف آغا محمود بیگ راحت پر ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی تحقیقات قابلِ قدر ہیں...... غلام قادر شاہ بٹالوی کی مثنوی رمز العشق مرتبہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی اپنے مضمون کے موضوع پر تحقیق کا اعلیٰ معیار پیش کرتی ہے اور ہنوز اس کی تحقیقات میں قابلِ ذکر اضافہ وترمیم نہیں ہو سکی۔ پانچویں مقالے کا عنوان یادگارِ چشتی ہے...... ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے یہ کتاب مرتب کی اور مقدمہ میں کتاب کے مصنف ''مولوی نور احمد چشتی'' کے حالات وکوائف تحقیق وجستجو سے جمع کیے ہیں۔ صحیح معنوں میں یہ مقالہ کتاب کی جان ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی رائے ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی تحقیقی استعداد کے بارے میں حرف بحرف درست ہے...... آخری مقالے کا عنوان ''قصہ خسروانِ عجم'' ہے...... کتاب کا غالباً واحد مقالہ ہے، جو تھوڑی بہت ترمیم کے بعد شاملِ کتاب کیا گیا ہے۔ (۱۴)

تحقیقی زاویے کا دوسرا حصہ (ب) دو اہم شخصیات سے متعلق ہے، جن میں ایک شخصیت مولانا غنیمت کنجاہی اور دوسری شخصیت فیروز الدین ڈسکوی کی ہے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے مولانا غنیمت کنجاہی کے بارے میں بعض غلط فہمیوں کو دور کیا ہے۔ اُن کے مطابق مولانا غنیمت کنجاہی کے بارے میں جن جن کتب میں اُن کا ذکر ملتا ہے وہ کئی حوالوں سے نامکمل ہے۔ اس سلسلے میں وہ چند تذکروں کا جائزہ لیتے ہیں جن میں ان کا ذکر شامل ہے۔ تذکرہ کلمات الشعرا مؤلفہ محمد افضل سرخوش، ثواقب المناقب از مولانا محمد ماہ صداقت کنجاہی ۱۱۲۶ھ، تذکرہ حسینی از حسین دوست خان سنبھلی ۱۱۲۳ھ، تذکرہ گل رعنا از شفیق اورنگ آبادی ۱۱۸۱ھ، تذکرہ مجمع النفائس قلمی از خان آرزو ۱۱۶۸ھ، تذکرہ مخزن الغرائب قلمی از احمد علی ہاشمی ۱۲۱۸ھ، تذکرہ ریاض الشعرا قلمی از علی قلی والا داغستانی ۱۲۵۱ھ، تذکرہ سلسلہ الاولیا قلمی از مولوی محمد صالح کنجاہی ۱۲۶۸ھ، تذکرہ انیس العاشقین (روٹو گراف) از رتن سنگھ زخمی ۱۲۳۰ھ تا ۱۲۴۰ھ غالباً اور تذکرہ شمع انجمن (مطبوعہ) از نواب صدیق حسن خان ۱۲۹۲ھ۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے پہلے سنِ ہجری کے مطابق ان تذکروں کو اچھی طرح کھنگالا اور پھر یہ ثابت کیا کہ ان تمام تذکروں میں مولانا غنیمت کنجاہی سے متعلق کسی نہ کسی حوالے سے ناقص معلومات درج ہیں۔ سنِ ہجری کے تذکروں کے بعد انھوں نے سن عیسوی کے مواد کا بڑی عرق ریزی سے جائزہ لیا اور بتایا کہ نظامی بدایونی کی قاموس

المشاہیر میں مولانا کے بارے میں چند مدحیہ جملوں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اس کے بعد ۱۹۲۷ء میں لیڈن سے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام شائع ہوا۔ اس میں مولانا کے بارے میں مضحکہ خیز معلومات درج ہیں۔ اس انسائیکلوپیڈیا کے مؤلفین نے مولانا کو لاہور کا گورنر بتایا ہے۔ اس کے بعد مولانا شرافت نوشاہی نے شریف التواریخ کی تیسری جلد میں مولانا غنیمت کنجاہی کو صومعہ نشین صوفی اور ایک ملامتی درویش ثابت کیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی کہتے ہیں:

مولانا غنیمت کنجاہی صوفی ضرور تھے لیکن صومعہ نشین درویش ہرگز نہ تھے۔ (۱۵)

الغرض اس مقالے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے ''مولانا غنیمت کنجاہی'' کے حوالے سے بہت سی غلط فہمیوں کو دور کیا ہے، مولانا کے بارے میں ناقص معلومات کو درست کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم اس مقالے میں مولانا غنیمت کنجاہی کے حالات و تصانیف سے متعلق مزید کام کی گنجائش موجود تھی۔ اس حصے کا دوسرا مقالہ مولوی فیروز الدین ڈسکوی سے متعلق ہے۔ اس مقالے میں مولوی فیروز الدین ڈسکوی کے حالاتِ زندگی محققانہ انداز سے درج کیے گئے ہیں۔ مولانا فیروز الدین نے عربی اور فارسی لغات پر تحقیقی کام کے علاوہ مذہبی موضوعات پر خاصا کام کیا ہے۔ مولوی صاحب ایک جید عالم دین بھی تھے۔ اُن کی تفسیر قرآن مجید مع تفسیر فیروزی قابلِ داد ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مولوی فیروز الدین ڈسکوی کی اُن متعدد کتب کا تعارف کروایا ہے جن کے بارے میں بہت سے اہلِ علم نہیں جانتے تھے۔ اس مقالے کے ذریعے مولوی فیروز الدین ڈسکوی کی شخصیت اور خدمات آئینے کی طرح صاف شفاف انداز میں ہمارے سامنے آ گئی ہیں۔ اِن دو مقالات کے بارے میں رفاقت علی شاہد رقم طراز ہیں:

مقالہ اوّل بنیادی طور پر مولانا غنیمت کنجاہی سے متعلق بعض ناقص معلومات کو درست شکل میں بیان کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔ مزید بہتر ہوتا اگر ڈاکٹر صاحب مولانا غنیمت کنجاہی کے حالات و تصانیف سے متعلق باقاعدہ مقالہ تحریر کرتے۔ دوسرا مقالہ ''مولوی فیروز الدین ڈسکوی'' کے حالات و آثار پر مشتمل ہے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے ممکنہ حد تک مکمل تحقیقات کا مظاہرہ کیا ہے۔ موجودہ حالت میں بھی یہ تحقیقی مقالہ دریافت اور معرکے کی چیز ہے۔ (۱۶)

اس کتاب کے تیسرے حصے (ج) کا عنوان ''مباحث'' ہے جس میں درج ذیل دو

مضامین شامل ہیں:

۱۔ فنِ تدوین میں اقتباسات و کتابیات

۲۔ قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات

پہلے مضمون ''فنِ تدوین میں اقتباسات و کتابیات'' میں مصنف نے موضوع سے متعلق بہت سی معلومات فراہم کی ہیں۔ اور فنِ تدوین سے متعلق سائنسی طریق کار کی وضاحت کی ہے جس سے فنِ تدوین کے مزاج کو سمجھنے میں ایک نئے محقق کے لیے آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ دوسرا مضمون ''قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات'' کے عنوان سے ہے۔ اِس مضمون میں اُردو ہندی قضیے سے متعلق ان دستاویزات کا ذکر کیا گیا ہے جو کافی عرصہ پہلے سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ کے اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئیں۔ دراصل یہ مضمون اُن کی اسی نام کی ایک مرتبہ کتاب کا مقدمہ ہے۔ اس کتاب کے چوتھے اور آخری حصے (د) کا عنوان ''نوادر'' تجویز کیا گیا ہے۔ اس عنوان کے تحت اس میں پانچ مقالات یا مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ پہلے مقالے کا عنوان ''رسالہ از آثار فقیر نوشہ ثانی'' ہے جس کے پہلے حصے میں فقیر نوشہ ثانی کے حالات و کوائف درج ہیں۔ اور ساتھ ہی مذکورہ رسالے کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد اس رسالے کا متن درج کیا گیا ہے جو فارسی زبان میں ہے۔

دوسرے مقالے کا عنوان ''ذوق کی وفات پر نادر قطعات تاریخ'' ہے۔ اِس مقالے میں پہلے ان قطعاتِ تاریخ کے شعرا احمد بخش یکدل، مولوی نور احمد چشتی اور مولوی محمد علی کے مختصر کوائف درج ہیں، پھر مہتمم مطبع کوہ نور کے نام فارسی میں لکھا گیا مولوی احمد بخش چشتی یکدل کا خط شامل ہے۔ اس کے بعد قطعات تاریخ درج کیے گئے ہیں۔ یہ قطعات اخبار کوہ نور، لاہور میں شائع ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے جن شعرا کے حالات دستیاب تھے، بڑے مختصر اور جامع انداز میں درج کر دیے ہیں۔ البتہ چوتھے قطعۂ تاریخ کے مصنف مولوی وحید الدین عظیم آبادی کے مفصل حالات اُن کی دسترس میں نہیں تھے اس وجہ سے تھوڑی سی کمی محسوس ہوتی ہے۔

تیسرے مقالے کا موضوع ''مولانا محمد حسین آزاد کے دو غیر مدوّن خط'' ہے۔ اس مقالے میں مصنف نے مختصر تعارف کے بعد آزاد کے دو خطوط درج کیے ہیں۔ یہ خطوط مکاتیب آزاد کے کسی مجموعے میں شامل نہیں تھے اس لیے ان کا سامنے لانا ضروری تھا۔ ۱۸۸۵ء میں آزاد نے

جب ایران کا سفر کیا اُس وقت یہ دو خطوط رفیق ہند کے مدیر مولوی محرم علی چشتی کے نام لکھے اور انھوں نے رفیق ہند میں شائع کر دیے۔ مولوی محرم علی چشتی، مولانا محمد حسین آزاد کے بیٹے محمد ابراہیم عرف ''ابرو'' کے ہم جماعت تھے۔ اس لحاظ سے آزاد انھیں اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔ مولوی محرم علی چشتی بھی آزاد کا بہت احترام کرتے تھے۔ آزاد اپنی کچھ اور تحریریں بھی رفیق ہند میں شائع کروانے کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن ذہنی حالت کچھ ایسی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے ارادے کی تکمیل نہ کر سکے۔

چوتھے مضمون کا عنوان ہے، ''اُردو مرثیہ کے نو دریافت مخطوطات''۔ یہ مضمون اُردو مراثی کی چھے بیاضوں کے مختصر تعارف پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں بہت احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ لگتا ہے گوہر نوشاہی اس مضمون پر زیادہ مواد فراہم نہیں کر سکے اور اگر انھوں نے دانستاً ایسا کیا ہے تو اختصار مضمون کی خوبی کے بجائے خامی بن گیا ہے۔

اس حصے کے آخری مضمون کا عنوان ہے، ''بچوں کے لیے ایک عمدہ تصنیف''۔ اس مضمون میں سیّد امتیاز علی تاج کی والدہ محترمہ اور تہذیب نسواں کی مدیرہ محمدی بیگم کی قلمی کتاب کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب محمدی بیگم نے اپنے بیٹے امتیاز علی تاج کی ذہنی وفکری اور روحانی تربیت کے لیے لکھی تھی۔ یہ سکول نوٹ بک کے ۱-۶ صفحات پر مشتمل تھی۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اسے کتاب خانۂ گنج بخش اسلام آباد سے حاصل کیا اور انتہائی محنت اور سلیقے سے اس کا تعارف کرایا ہے۔ اس کتاب کی دریافت اور ساخت و پرداخت ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے تحقیقی شعور کی عکاس ہے۔ ان کے تحقیقی کاموں میں یہ عمدہ اضافہ ہے۔ اس کی وجہ سے ایک اہم مصنفہ کا کام اہلِ علم کے سامنے آ گیا۔

۳۔ ادبی زاویے

ادبی زاویے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے مختلف موضوعات پر لکھے گئے تنقیدی مقالات شامل ہیں۔ اس کتاب کا پیش لفظ پروفیسر ڈاکٹر صدیق شبلی نے لکھا اور دسمبر ۱۹۹۳ء میں اسے مجلس فروغِ تحقیق، اسلام آباد نے شائع کیا۔ ادبی زاویے میں شامل تمام مقالات وقتاً فوقتاً پاکستان کے مقتدر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں نئے اور پرانے بھی مقالات شامل ہیں۔ یہ مقالات موضوعاتی اعتبار سے کسی خاص مزاج کے حامل نہیں۔ بلکہ یہ ڈاکٹر صاحب کے

مطالعے کی آزادہ روی کے عکاس ہیں۔ البتہ ایک بات اہم ہے کہ اِن تمام مقالات میں ڈاکٹر صاحب کا تحقیقی مزاج غالب نظر آتا ہے۔ اس بات کا اظہار خود ڈاکٹر صاحب نے بھی کیا ہے۔ کتاب میں ''خودنوشت'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

> یہ مقالات موضوعاتی اعتبار سے کسی خاص مزاج سے وابستہ نہیں ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان میں میرے مطالعے کی آزادہ روی اور تنوع شامل ہے۔ ایک پہلو جو اِن سب میں مشترک ہے، وہ میرا مجموعی رویہ ہے، جس میں تحقیقی پہلو زیادہ نمایاں نظر آئے گا۔ (۱۷)

ادبی زاویے کو چار ابواب یعنی چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے کا عنوان ''تنقید'' ہے جس میں درج ذیل مقالات شامل ہیں۔

۱۔ اُسلوب
۲۔ لکھنوی تہذیب اور فسانۂ آزاد
۳۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا اندازِ تحقیق
۴۔ بریشمِ عود ایک تاثر
۵۔ ظفر اقبال کی شاعری
۶۔ اُردوئے معلیٰ کا میر سوز نمبر
۷۔ پاکستان میں فارسی ادب
۸۔ محبتوں کے درمیاں

اس حصے کے پہلے مضمون کا عنوان ''اُسلوب'' ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے کمال ناقدانہ انداز میں لفظ اُسلوب کی وضاحت کی ہے۔ وہ اُسلوب کو تین حیثیتوں میں تقسیم کرتے ہیں:

۱۔ زبان
۲۔ خیال
۳۔ فن کار کی شخصیت

اُن کے خیال میں یہ تینوں حیثیتیں جب گھل مِل جاتی ہیں تو اُسلوب پیدا ہوتا ہے۔ اور ہر فنکار کا اُسلوب الگ ہوتا ہے جو اُسے انفرادیت عطا کرتا ہے۔ اس مضمون کے آخر میں ڈاکٹر

صاحب نے ''حسن'' پر بات کی ہے۔ اُن کے نزدیک حُسن کے تین عوامل ہیں:

۱۔ ہم آہنگی

۲۔ وحدت

۳۔ تناسب

پھر ان تینوں عوامل کی خوبصورتی کے ساتھ وضاحت کی ہے۔ ''تنقید'' کے حوالے سے ''اُسلوب'' ایک اہم مضمون ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس حصے کے دوسرے مقالے کا عنوان ہے ''لکھنوی تہذیب اور فسانۂ آزاد''۔ اس مضمون میں انھوں نے لکھنوی تہذیب اور لکھنوی تہذیب کے پس منظر پر روشنی ڈالی ہے اور اس تہذیب کے الم ناک انجام کا تجزیہ کیا ہے۔ یہاں ڈاکٹر صاحب کے چند جُملے موقع محل کے ساتھ درج کرنے اہم ہیں جو اِس مضمون میں مختلف مواقع پر لکھے گئے ہیں۔ ان سے ڈاکٹر صاحب کے تنقیدی اُسلوب کی وضاحت بخوبی ہوتی ہے۔ جب غازی الدین حیدر کے اقتدار کا سورج ڈوب رہا تھا اُس کی نفسیاتی اُلجھن کو ڈاکٹر صاحب نے اس طرح واضح کیا:

''اقتدار کی موت جسم کی موت سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔'' (ادبی زاویے: ص ۲۸)

واجد علی شاہ کی معزولی کے وقت سرشار کی عمر ۹ یا ۱۰ سال تھی۔ سرشار بچپن ہی میں لکھنؤ کی رنگینیاں دیکھ چکے تھے۔ اس بات کو ڈاکٹر صاحب اِس انداز میں بیان کرتے ہیں:

''بچپن کے دیکھے ہوئے خواب آخر عمر تک منہ میں ذائقے بن کر بسے رہتے ہیں۔'' (ادبی زاویے: ص ۳۰)

ڈاکٹر صاحب لکھنوی تہذیب کی عکاسی کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''مرد کل کے گھوڑے ہیں جن کی چابی جنس کے وحشت ناک جذبوں اور حواس کے سطحی ذائقوں کے پاس ہے۔ عورتیں سلو لائٹ کی رنگین اور خوب صورت گڑیاں ہیں جنھیں چومنے کو تو دل چاہتا ہے لیکن بے روح ہونے کی وجہ سے اُن سے عشق نہیں کیا جاسکتا۔'' (ادبی زاویے: ص ۲۹)

اس حصے کے تیسرے مضمون کا عنوان ہے، ''ڈاکٹر جمیل جالبی کا اندازِ تحقیق''۔ اس مضمون

میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے ڈاکٹر جمیل جالبی کے پیش رو محققین کا ذکر کیا ہے اور ڈاکٹر جمیل جالبی کے اندازِ تحقیق پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر جمیل جالبی کو اُن کے طریق کار کے مطابق پنجاب کے دبستانِ تحقیق سے زیادہ قریب قرار دیا ہے۔ اس حصے کے چوتھے مضمون کا عنوان ہے، ''بریشمِ عود ایک مطالعہ''۔ یہ مضمون عابد علی عابد کی کتاب بریشمِ عود کا اختتامیہ ہے اس میں گوہر نوشاہی نے عابد علی عابد کی شاعری پر ناقدانہ انداز میں گفتگو کی ہے اور عابد صاحب کی شاعری کے کئی پوشیدہ گوشوں کو اُجاگر کیا ہے۔

اس حصے کا پانچواں مضمون ''ظفر اقبال کی شاعری'' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون میں گوہر نوشاہی نے بڑے سلیقے سے ظفر اقبال کی شاعری کا دفاع کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ ظفر اقبال کی شاعری پنجاب کی سرزمین سے جڑی ہوئی ہے۔ ظفر اقبال کی شاعری میں الفاظ اساطیر نہیں بلکہ تخلیقی تجربے ہیں۔ اُن کی شاعری میں استعمال ہونے والا ہر ''لفظ'' اس ''زمین'' سے جڑا ہوا ہے جس نے ظفر اقبال کو جنم دیا۔ وہ الفاظ جن میں وجود اور زمین کی قربت نہیں، بے کار ہوتے ہیں۔ اس حصے کا چھٹا مضمون ''اُردو معلّٰی کا میر سوز نمبر'' ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اُردو معلّٰی مجلہ دہلی یونیورسٹی کے اربابِ ادارت کے اس ادبی کارنامے کو سراہا ہے کہ انھوں نے اِس مجلّے میں میرسوز کا پورا دیوان شائع کر کے بہت بڑی ادبی خدمت انجام دی ہے۔ اس کے بعد میر سوز کے کلام پر عمدہ تبصرہ کیا گیا ہے، جس سے ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے جوہر کُھل کے سامنے آئے ہیں۔ اس مقالے میں کلامِ سوز کے مرتب کے تحقیقی تصورات کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

اس حصے کا ساتواں مضمون ہے، ''پاکستان میں فارسی ادب (جلد چہارم) پر ایک نظر''۔ اس مضمون میں ڈاکٹر ظہورالدین احمد کی معروف تصنیف **پاکستان میں فارسی ادب** کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ یہ کتاب برصغیر میں فارسی کی تاریخ اور ثقافت کی داستان ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے **پاکستان میں فارسی ادب** پر تبصرہ کیا ہے۔ اس حصے کے آٹھویں نمبر پر آنے والے مضمون کا عنوان ہے، ''محبتوں کے درمیاں''۔ **محبتوں کے درمیاں** ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے دوست اشرف ندیم کے سفر نامہ چین کے بارے میں ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے پہلے اشرف ندیم کا تعارف کروایا ہے اور بعد میں اُن کے سفرنامے پر بات کی ہے۔ ڈاکٹر صدیق شبلی ادبی زاویے کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> اس کتاب میں ان کے پانچ تبصرے شامل ہیں۔ **بریشم عود** پر ان کا تاثراتی تبصرہ

بہت خوب صورت ہے...... اپنے دوست اشرف ندیم کے سفر نامہ چین کے بارے میں اپنے تاثرات کو دلکش انداز میں تحریر کیا ہے...... اُردو معلّٰی کے سوز نمبر اور پاکستان میں فارسی ادب پر ان کے تبصرے بہت زور دار ہیں۔ ان دونوں مضامین میں گوہر کے جوہر خوب کھلے ہیں...... اسی طرح ''پاکستان میں فارسی ادب'' کے بعض کمزور حصوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ اِن تبصروں میں گوہر نوشاہی کے کاٹ دار جملے بڑا لطف دیتے ہیں۔ (۱۸)

ادبی زاویے کے دوسرے باب کا عنوان ''تحقیق'' ہے جس میں درج ذیل مضامین شامل ہیں:

۱۔ سودا کے ایک قصیدے کا قدیم ترین متن
۲۔ کلامِ فگار
۳۔ مثنوی گنج الاسرار
۴۔ صوفیائے سندھ اور پنجاب کے روابط
۵۔ محمڈن ڈائی سیز کے تین اُردو تراجم
۶۔ اُردو تحقیق پر ایک مصاحبہ

اس باب کے پہلے مضمون کا عنوان ''سودا کے ایک قصیدے کا قدیم ترین متن'' ہے۔ یہ متن ۱۱۸۳ھ اور ۱۲۱۹ھ کے درمیان لکھی گئی ایک قلمی بیاض میں شامل ہے۔ یہ بیاض ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ سودا کے اس اُردو قصیدے کا مطلع یہ ہے:

صبح ہوتے جو گئی آج میری آنکھ جھپک
دی وہیں آ کے خوشی نے درِ دل پر دستک

ڈاکٹر صاحب نے اس کا دوسرے دستیاب قلمی نسخوں سے موازنہ کیا اور ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ یہ اُن کی عمدہ دریافت ہے۔ یہ قصیدہ نواب غازی الدین خان کی تعریف میں لکھا گیا تھا۔ اس باب کے دوسرے مضمون کا عنوان ''کلامِ فگار'' ہے اس مضمون میں میر حسین فگار کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ فگار دہلی کے رہنے والے تھے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے انھیں اسد اللہ خان غالب کا شاگرد بھی لکھا ہے۔ اِس مضمون میں ممکنہ حد تک فگار کے بارے میں معلومات

فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور نمونۂ کلام اِس مضمون کی جان ہے۔

تیسرے مضمون کا عنوان ''مثنوی گنج الاسرار'' ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مطابق مثنوی گنج الاسرار اُردو کی قدیم تصانیف میں شامل ہے جس کا ذکر حافظ محمود شیرانی یا کسی دوسرے محقق کے یہاں نہیں ملتا۔ یہ مثنوی سلسلہ نوشاہیہ کے بانی حضرت گنج بخشؒ کے عارفانہ کلام پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اس مثنوی کا عمدہ انداز میں تعارف کروایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب فقہ ہندی سے بھی اِسے قدیم ترین تصنیف قرار دیتے ہیں۔ شیرانی صاحب نے فقہ ہندی (۱۰۷۴ھ) کو پنجاب میں اُردو کی قدیم ترین تصنیف قرار دیا تھا جبکہ ڈاکٹر صاحب نے اِس کے برعکس مثنوی گنج الاسرار کو قدیم ترین تصنیف قرار دیا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر صدیق شبلی رقم طراز ہیں:

> ڈاکٹر گوہر نوشاہی ایک بلند پایا محقق ہیں..... پنجاب کی تاریخ وتہذیب اورادب و تصوف پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ مثنوی گنج الاسرار پر ان کا مضمون پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے پنجاب میں اُردو کے بعض نئے گوشے دریافت کر کے حافظ محمود شیرانی کے کام کو آگے بڑھایا ہے اور اس پر اضافہ کیا ہے۔ (۱۹)

تیسرا باب ''جائزے'' کے عنوان سے ہے جس میں درج ذیل مضامین شامل ہیں:

۱۔ قطر میں اُردو

۲۔ مجلس ترقی ادب کے دہ سال

۳۔ مقتدرہ قومی زبان کے دس سال

پروفیسر ڈاکٹر صدیق شبلی رقم طراز ہیں:

> ادبی زاویے میں گوہر صاحب کے تین جائزے بھی شامل ہیں۔ پہلے کا تعلق مجلس ترقی ادب کی دہ سالہ کارگزاری سے ہے۔ اس میں مجلس کی اشاعتی ترجیحات، اصول تدوین، املا تک کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ عرصہ قطر میں بھی تدریسی خدمات سرانجام دی ہیں۔ قطر میں اُردو لکھ کر انھوں نے خلیجی ممالک میں اُردو کی وسعت پذیر قلم رو کی نشاندہی کی ہے۔ ''مقتدرہ قومی زبان کے دس سال'' بھی ایک خشک جائزے کی بجائے ایک دلچسپ مطالعہ ہے۔ (۲۰)

آخری باب ''تاثرات'' کے عنوان سے ہے۔ اس حصے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے سیّد امتیاز علی تاج اور عابد علی عابد کی وفات پر جو تاثراتی مضامین لکھے وہ شامل کیے گئے ہیں۔ ان مضامین کے پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ گوہر نوشاہی کی اِن دو شخصیات سے کتنی قلبی وابستگی تھی۔ پروفیسر نظیر صدیقی ادبی زاویے پر اپنی رائے کا اظہار اِس طرح کرتے ہیں:

> Dr. Naushahi's book Adbi Zavia is a combination of literary criticism, research, interview, literary survey and impressions about personalities. It contains highly informative and valuable essays under each sub heading. The preface of the book is written by his friend Dr. Siddiq Shibli. It throws light on the factors which have gone in the making of Dr. Gohar Naushahi have gone in the litterateur and research scholar.(۲۱)

۴۔ یادگارِ سرسیّد

یادگارِ سرسیّد مجلس فروغ تحقیق اسلام آباد سے ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کا مقدمہ خود مصنف نے تحریر کیا ہے اور اس کے لیے ''حرفِ چند'' مشفق خواجہ نے لکھا ہے۔ سرسیّد کا انتقال ۲۷/ مارچ ۱۸۹۸ء کو ہوا۔ یومِ وفات سے لے کر دسمبر ۱۸۹۸ء تک سرسیّد کے بارے میں مختلف اخبارات و رسائل میں جو تعزیتی مواد شائع ہوا، ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے بڑے سلیقے سے اُسے اِس کتاب میں یکجا کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے ''یادگارِ سرسیّد'' کو پاکستان کی سرزمین پر ''سرسیّد کے غم نامے'' کا نام دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یادگارِ سرسیّد تحقیقی نوعیت کی دستاویز ہے۔ سرسیّد پر اب تک جتنا کام ہو چکا ہے اس میں یادگارِ سرسیّد کو اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد مقام حاصل ہے۔ اس کتاب میں جہاں اہلِ وطن کا سرسیّد سے عقیدت کا اظہار ملتا ہے وہاں اس بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ سرسیّد کی شخصیت اور ان کے علمی کارناموں کو اس خطے پر کتنی اہمیت حاصل ہے۔ یادگارِ سرسیّد

کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ تعزیتی مقالات و تقاریر

۲۔ تعزیتی اجلاس

۳۔ منظوم خراج تحسین مرثیے قطعات و مادہ ہائے تاریخ

۴۔ سرسیّد میموریل فنڈ

۵۔ متفرق خبریں تاثرات و منقولات

۶۔ ضمیمے

ڈاکٹر گوہر نوشاہی اس کتاب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

یادگارِ سرسیّد ایک ایسی شخصیت کی بعد از وفات تجلیل و تکریم کی سرگزشت ہے جو سیاسی، فکری، ثقافتی اور علمی اعتبار سے ہمارے قومی اکابر میں شمار ہوتی ہے۔ سرسیّد کی وفات پر برصغیر میں غم والم کی جو لہر پھیلی اہلِ پاکستان اس ماتم گساری میں پیش پیش تھے۔ اس دور میں یہاں کے اخبارات نے جو خبریں، قراردادیں، مقالے اور تعزیتی جلوسوں کی رپورٹیں شائع کیں، زیرِ نظر کتاب میں انھیں معاصر شہادتوں کے ساتھ یکجا کر دیا گیا...... اس کتاب کے حوالے سے سرسیّد شناسی کا ایک اہم پہلو نمایاں ہو رہا ہے۔ اور وہ یہ کہ سرسیّد اپنے عہد کی ایک ایسی مقبولِ عام اور مقبولِ عوام شخصیت کا نام ہے جس کی کمی دور دور تک محسوس کی گئی۔ (۲۲)

یادگارِ سرسیّد میں شامل تحریریں پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسیّد کی شہرت و مقبولیت کا کیا عالم تھا۔ وہ کتنی اہم شخصیت تھی جس کی وفات پر پورے برصغیر میں غم والم کی ایک لہر پھیل گئی۔ اس کی یاد میں تعزیتی جلسے منعقد کیے گئے۔ اہلِ علم و دانش نے اپنی تحریروں، مقالات اور مضامین کے ذریعے سرسیّد کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا۔ اِن تحریروں کے پڑھنے سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ سرسیّد کی تحریک نے کس قدر برصغیر میں شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ طرح طرح کی مخالفتوں کے باوجود سرسیّد نے اپنے کام کو کس عزم اور حوصلے سے جاری رکھا اور اپنی قوم سے سرسیّد کو کس قدر محبت، عزت اور عقیدت نصیب ہوئی۔ مشفق خواجہ کتاب پر اپنی رائے کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

زیرِ نظر کتاب یادگارِ سرسیّد گوہر صاحب کی تحقیق وتلاش کا ایک عمدہ نمونہ ہے، جس میں انھوں نے سرسیّد کی وفات پر معاصر ردِعمل کو یکجا کردیا۔ اس کے بعد ایک عرصے تک برصغیر کے گوشے گوشے میں تعزیتی جلسے منعقد ہوتے رہے اور اخبارات میں مضامین کی اشاعت عمل میں آتی رہی...... ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے نادر و کمیاب اخبارات سے سرسیّد سے متعلق تحریروں کو حاصل کرکے زیرِ نظر کتاب میں بڑے سلیقے سے جمع کردیا ہے۔ اِن تحریروں سے سرسیّد کی مقبولیت اور ان کی تحریک کی وسعت و ہمہ گیری کا صرف اندازہ نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سرسیّد کو طرح طرح کی مخالفتوں کے باوجود اپنی قوم سے جو محبت، عقیدت اور عزت ملی وہ صرف برگزیدہ ہستیوں ہی کے حصے میں آتی ہے۔ [۲۳]

یادگارِ سرسیّد گوہر نوشاہی کا اہم تحقیقی کام ہے۔ انھوں نے مختلف اخبارات کی خبریں، قرار دادیں، مقالے اور تعزیتی رپورٹیں انتہائی محنت اور سلیقے سے نہ صرف معاصر شہادتوں کے ساتھ ایک جگہ اکٹھی کیں بلکہ وہ محققانہ انداز میں اُن کو منظرِ عام پر بھی لائے۔ پروفیسر نظیر صدیقی یادگارِ سرسیّد پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> Dr. Naushahi has painstakingly collected all the elegies composed at the death of Sir Syed and the proceedings of the condolence meetings held on the occasion ... We must salute a researcher like Dr. Naushahi who has gathered together untraceable pieces of speeches and writings which show in how much respect and love Sir Syed was held by his co-religionists in the whole of India. [۲۴]

۵۔ مطالعۂ غالب

مطالعۂ غالب ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے غالب سے متعلق چند مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس

سلسلے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں:

> مطالعۂ غالب کا شوق مجھے اُردو کے نامور نقاد اور محقق سیّد عابد علی عابد مرحوم و مغفور کے حلقۂ ارادات اور استاد گرامی جناب ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کے فیضِ محبت سے حاصل ہوا۔ اور کلامِ غالب کے عمیق مطالعے کا علمی درس پروفیسر حمید احمد خان مرحوم نے دیا۔ اِن بزرگوں کے خوانِ کرم کی خوشبو اِن مقالات کا طرہ امتیاز ہے۔ (۲۵)

اس کتاب کے پہلے مقالے کا عنوان ہے، ''حیاتِ غالب سنین کے آئینے میں''۔ اس مقالے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے غالب کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے تمام اہم واقعات قلم بند کر دیے ہیں۔ یہ مقالہ کتاب سے پہلے ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے مرتبہ **دیوانِ غالب** (نسخہ طاہر) میں شائع ہو چکا تھا اور متعدد اہم جرائد اِسے نقل بھی کر چکے تھے۔

دوسرا مقالہ ''دیوان غالب نسخہ طاہر'' کے عنوان سے ہے اور تیسرے مقالے کا عنوان ہے ''دیوان غالب نسخۂ شیرانی اور عرشی کا تقابلی مطالعہ''۔ نسخۂ شیرانی سے مراد **دیوانِ غالب** کا ایک نادر مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ شیرانی میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ پہلے حافظ محمود شیرانی کی ملکیت تھا اس لیے اسے نسخۂ شیرانی کہا جاتا ہے۔ اس تیسرے مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے دو نسخوں یعنی نسخۂ شیرانی اور عرشی کا بڑی محنت اور عرق ریزی سے تقابلی جائزہ لیا ہے۔

اس کتاب کا چوتھا مقالہ ''دیوانِ غالب نسخہ حمیدیہ کی تدوینِ نو'' کے عنوان سے ہے۔ نسخہ حمیدیہ، مفتی انوار الحق کا مرتبہ **دیوانِ غالب** جو ۱۹۲۹ء میں بھوپال سے شائع ہوا تھا، اس کی تدوینِ نو کا قصہ کچھ اس طرح ہے کہ ۱۹۶۸ء میں پروفیسر حمید احمد خاں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ مجلسِ ترقیِ ادب نے پروفیسر حمید احمد خاں سے فرمائش کی کہ مفتی انوار الحق کے اِس مرتبہ **دیوانِ غالب** کی از سرِ نو تدوین کریں۔ پروفیسر حمید احمد خاں اس کام کو بروقت انجام دینا چاہتے تھے۔ اپنی بے شمار مصروفیات کی بنا پر انھوں نے مجلسِ ترقیِ ادب کے ناظم سیّد امتیاز علی تاج سے فرمائش کی کہ عملے میں سے کسی سکالر کو ان کی معاونت کے لیے معمور کریں۔ اس پر سیّد صاحب نے یہ ذمہ داری ڈاکٹر گوہر نوشاہی کو سونپ دی، جسے ڈاکٹر صاحب نے بڑی محنت اور لگن سے نبھایا۔ (۲۶)

اس کتاب کا پانچواں مقالہ ''مرزا غالب کی نثر نگاری'' کے عنوان سے ہے۔ اس مقالے میں غالب کے اُسلوبِ نگارش پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کا آخری مقالہ ''اسد اللہ خان غالب بمرد'' کے عنوان سے ہے۔ غالب کی وفات پر اُن کے عقیدت مندوں نے جو قطعات لکھے، اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے وہ قطعات مع تاریخ درج کر دیے ہیں۔ ان مقالات کے بارے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں:

> اِن میں تین مقالات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، ''دیوان غالب، نسخۂ شیرانی اور عرشی کا تقابلی مطالعہ''۔ اور غالب کی وفات پر قطعاتِ تاریخ پر غالبیات کے ممتاز محقق اور نقاد جناب مالک رام نے مجھے تعریفی کلمات سے نوازا اور ''دیوانِ غالب نسخہ حمیدیہ کی تدوین نو'' نے استاد گرامی ڈاکٹر وحید قریشی سے داد پائی۔ میرے لیے اِن بزرگوں کے تاثرات سرمایۂ افتخار ہیں۔ (۲۷)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے تحقیقی مزاج کی خوبی ہے کہ وہ خالص علمی قدر و قیمت کے موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں اور ایسی محنت اور لگن سے لکھتے ہیں کہ موضوع کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ ان کے مطالعے کی وسعت ان کے تحقیقی کاموں میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ زیرِ نظر کتاب **مطالعۂ غالب** ان کے تحقیقی مزاج کی آئینہ دار ہے۔ اس کتاب کے فلیپ پر پروفیسر نثار احمد فاروقی اپنی رائے کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> زیرِ نظر کتاب **مطالعۂ غالب**، ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے ایسے پانچ محققانہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ پہلا مضمون حیاتِ غالب متن کے آئینے میں، مختصر مگر مفید ہے۔ دوسرا اہم مضمون حیاتِ غالب کے نسخہ طاہر کا تعارف، یہ نسخہ یقیناً بہت اہم تھا مگر اب اصل دستیاب نہیں اور آغا محمد طاہر نے اِسے اپنے طور پر اپنے املا میں نقل کر کے چھاپا...... آخری مضمون اسد اللہ خان غالب بمرد، غالب کی وفات پر ان کے شاگردوں اور دوستوں کے قطعاتِ تاریخ پیش کرتا ہے...... یہ پانچوں مضامین تحقیقی اعتبار سے استوار اپنے اُسلوب دلچسپ اور غالبیات کا گہرا مطالعہ کرنے والوں کے لیے معاون ہیں۔ (۲۸)

۶۔ لاہور میں اُردو شاعری کی روایت

یہ کتاب ۱۹۹۱ء میں مکتبہ عالیہ، لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کے صفحات کی کل تعداد ۱۹۱ ہے۔ یہ کتاب دراصل ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا ایم۔اے کا تحقیقی مقالہ ہے، جوانھوں نے ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی نگرانی میں تحریر کیا تھا۔ اس مقالے میں لاہور کے تاریخی و تہذیبی پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے اور لاہور میں اُردو زبان وادب کے فروغ کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ہند، ایرانی تہذیب کا سب سے پہلا مرکز پنجاب ہے اور پھر پنجاب میں لاہور کو اوّلیت حاصل ہے۔ سلاطین غزنی نے تقریباً دو صدیوں تک اس پر اپنا قبضہ جمائے رکھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ جس طرح غزنی ''تہذیب وتمدن'' اور ''علم وفن'' کا گہوارہ رہا تھا، اسی طرح لاہور بھی اب تہذیب و تمدن کا مرکز مانا جانے لگا۔ چنانچہ اُردو زبان کا اوّلین ڈھانچہ یہیں سے تیار ہوا اور بعد کے ادوار میں بھی علم وادب کے حوالے سے لاہور کو مرکزیت حاصل رہی۔ اسے چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلے باب کا عنوان ''لاہور میں اُردو شاعری کی قدیم روایت'' ہے۔ دوسرے باب کو مزید تین ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ ہجرت کا دور

۲۔ انجمن پنجاب اور مشاعروں کا دورِ اوّل

۳۔ انجمن پنجاب اور مشاعروں کا دورِ ثانی

باب سوم میں درج ذیل موضوعات شامل ہیں:

۱۔ ادبی صحافت کا دور

۲۔ لاہور کا شعری ماحول پہلی جنگِ عظیم سے دوسری جنگِ عظیم تک

۳۔ نیاز مندانِ لاہور

دوسرے اور تیسرے باب میں بیسویں صدی کے ربع اوّل کے ادبی ماحول پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں انجمنِ پنجاب کے مشاعروں کا دور قابلِ ذکر ہے۔ تیسرے حصے میں نیاز مندانِ لاہور کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چوتھا باب ''اقبال'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں اقبال کی ادبی زندگی کے ابتدائی دور کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ پانچواں باب

''تحریکات'' کے عنوان سے ہے۔ اس حصہ میں رومانی تحریک، ترقی پسند تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ کتاب کے چھٹے باب کا عنوان ''جدید ترین شاعری'' ہے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۳ء کے عرصے لاہور میں اُردو شاعری نے جو رُجحانات اختیار کیے، نئی نظم میں میراجی اور ترقی پسند تحریک نے اُردو شاعری میں کیا تبدیلیاں پیدا کیں، اس باب میں اِن تمام باتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم سیکرٹری انجمنِ ترقیِ اُردو ہند (دہلی) لکھتے ہیں:

> زیرِ نظر کتاب ''لاہور میں اُردو شاعری کی روایت'' اُردو ادب کی تاریخ کے نقطۂ نظر سے بہت اہم اور قابلِ قدر کام ہے...... انیسویں صدی کے نصف آخر سے آج تک لاہور ایک اہم ادبی مرکز رہا ہے۔ اور مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے بہت سلیقے، محققانہ اور منصفانہ انداز میں اس تہذیبی اور ادبی مرکز کے تمام پہلوؤں کا اس طرح جائزہ لیا ہے کہ یہ کتاب تاریخِ ادب اُردو کا ایک اہم حصہ بن گئی ہے۔ (۲۹)

۷۔ قیامِ پاکستان پر ایک محنت کش کا روزنامچہ

یہ کتاب مقتدرہ قومی زبان (اسلام آباد) نے ۱۹۷۷ء میں شائع کی۔ اس کے صفحات کی کل تعداد ۸۸ ہے اور اس کا پیش لفظ افتخار عارف نے تحریر کیا ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے جب تحریک پاکستان کا آغاز کیا تو برصغیر پاک و ہند میں رہنے والے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں نے قائداعظم کا ساتھ دیا۔ قائداعظم محمد علی جناح کی رہنمائی میں اِن مسلمانوں نے اپنے لیے ایک الگ وطن کا مطالبہ کیا۔ اس تحریک میں لاہور کا ایک ریلوے مکینک بشیر حسین بخاری بھی شامل تھا۔ یہ کتاب بشیر حسین بخاری کے روزنامچے پر مشتمل ہے۔ بشیر حسین بخاری نارتھ ویسٹرن ریلوے لاہور میں کام کرتا تھا۔ اس نے پاکستان کے نہایت نازک دور کو محفوظ کیا ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اس پر سترہ صفحات پر مشتمل ایک پیش لفظ تحریر کیا ہے جس سے اس کتاب کی اہمیت واضح ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر محمود الرحمٰن کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی گوہر شناس نظر نے اسے فٹ پاتھ سے اٹھایا اور ۲۸۶ صفحات کے روزنامچے کا بڑے انہماک سے مطالعہ کرنے کے بعد محسوس کیا کہ یہ تحریکِ پاکستان پر ایک نہایت قیمتی و تاریخی دستاویز ہے۔ (۳۰)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے تحقیقی مزاج کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کسی بھی دریافت کو غیر اہم نہیں سمجھتے۔ اسی مزاج کے پیشِ نظر انھوں نے اس روزنامچے کو فٹ پاتھ سے اٹھایا، اس سے متعلق لاہور کے بزرگ شہریوں سے ملاقاتیں کر کے معلومات اکٹھی کیں، اس کے مطالب کا خلاصہ کیا اور اس پر اہم حاشیائی نوٹ دے دیے۔ جس کے نتیجے میں ریلوے مکینک بشیر حسین بخاری کا ''روزنامچہ'' کتابی صورت اختیار کر کے قیامِ پاکستان کے حوالے سے اہم دستاویز بن گیا۔ یہ کتاب تحریکِ پاکستان اور تاریخ پاکستان سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے قابلِ قدر دستاویز ہے۔ افتخار عارف زیرِ نظر کتاب کے ''پیش لفظ'' میں لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے تحقیقی سفر میں اس روزنامچے کی دریافت اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس سے تحریکِ پاکستان کو ایک نئے زاویے سے دیکھا جائے گا۔ انھوں نے جس محنت اور لگن سے اس روزنامچے کے بارے میں تحقیقی مواد جمع کیا ہے اور اس پر مفید حواشی لکھے ہیں وہ اِن کے علمی مزاج کا خاصہ ہیں۔ (۳۱)

مشیر انور تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> This man was a certain Syed Bashir Hussain Bukhari worker of Railway workshop at Lahore who died in 1987, but of whose 67 years of life the account of two year alone that he jotted down on brown railway department stationery shall keep him alive as a man of some virtue and many flaw ... Dr. Naushahi's selections from the diary are restricted to the political scene of the day as this is a presentation in the context of the Golden Jubilee of Independence. It is amply annotated and gives you a fair idea of the Pakistan

movement's progress in the key city of Lahore.(۳۲)

۸۔ فرہنگ مشترک

فرہنگ مشترک ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے مقتدرہ قومی زبان کے لیے تالیف کی۔ تنظیم برائے اقتصادی تعاون نے دس ممالک کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا اِن دس ممالک میں پاکستان، ایران، ترکی، افغانستان، ترکمانستان، ازبکستان، کرغستان، قازقستان اور آذر بائیجان شامل ہیں۔ فرہنگ مشترک ای.سی.او. میں شامل دس ملکوں کی زبانوں کا مشترک سرمایہ ہے۔ یہ زبانیں اُردو، فارسی، ترکی، تاجکی، ازبکی، ترکمن، قازق، قرغیز اور آذری ہیں۔ یہ فرہنگ کم و بیش ۵۵۰۰ الفاظ پر مشتمل ہے۔ فارسی کو ایک طویل مدت تک اس خطے کی سرکاری، علمی، تہذیبی اور مکالماتی زبان کا درجہ حاصل رہا ہے۔ اور ایران، افغانستان، تاجکستان میں آج بھی فارسی زبان بولی جاتی ہے، اس لیے فرہنگ مشترک میں زیادہ الفاظ فارسی زبان کے ہیں۔ اس کتاب کا پیش لفظ افتخار عارف نے تحریر کیا ہے۔ اور اس کا مقدمہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے مختصر مگر جامع انداز میں قلم بند کیا ہے۔ یہ مقدمہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے تحقیقی و تنقیدی مزاج کا آئینہ دار ہے۔ ڈاکٹر محمد صدیق شبلی لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر گوہر نوشاہی کہنہ سال نہ سہی کہنہ مشق محقق ضرور ہیں۔ اب تک ان کی دزوزجن کے قریب کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں...... اس کتاب کا خیال، اس کا نام اور تالیف سبھی قابلِ ستائش ہیں۔ یہ اس خطے میں بسنے والے لوگوں کے درمیان پہلے سے موجود تعلقات کو اور زیادہ مستحکم بنانے کی ایک کوشش ہے۔(۳۳)

فرہنگ مشترک کی تالیف کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اِن دس ممالک کے درمیان تعلقات زیادہ مضبوط ہوں تاکہ سیاسی اور معاشی تعلقات میں بہتری لائی جا سکے۔ قومی اتحاد کے لیے مذہب اور ثقافت کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے لیکن حالیہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اقوام کے درمیان اتحاد کا انحصار مذہب اور ثقافت کے ساتھ ساتھ معاشی اور سیاسی شعور پر بھی ہوتا ہے۔ قوموں کے درمیان اتحاد برقرار رکھنے کے لیے معاشی اور سیاسی استحکام بنیادی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ کتاب کے پیش لفظ میں افتخار عارف لکھتے ہیں:

گزشتہ پچاس برسوں میں ہم اپنے ثقافتی ورثے سے دور رہے اور بڑی حد تک رفتہ رفتہ اسے فراموش کر بیٹھے۔ زیرِ نظر کتاب فرہنگ مشترک نے ہمیں پھر سے اپنے گم شدہ ثقافتی، لسانی اور فکری سرمائے کی بازیافت کا احساس دلایا۔ اس کتاب کے مؤلف ڈاکٹر گوہر نوشاہی پاکستان کے ممتاز محقق اور اہلِ علم میں سے ہیں۔ انھوں نے اس کام سے جس محنت اور عرق ریزی کا ثبوت دیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ لسانی حوالہ ثقافت شناسی کا ایک پہلو ہے، ہم اس کی مدد سے بعض دوسرے اہم پہلوؤں کی طرف بھی جا سکتے ہیں۔ (۳۴)

پروفیسر نظیر صدیقی لکھتے ہیں:

معروف محقق ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے تنظیم برائے اقتصادی تعاون کے تحت متحد ہونے والے دس ممالک میں بولے جانے والے مشترک الفاظ پر مشتمل لغت مرتب کی ہے...... اس کتاب کی تیاری بے شک محنت اور استقامت کا ایک کارِ نمایاں ہے۔ (۳۵)

پروفیسر فتح محمد ملک اپنی رائے کا اظہار اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

گوہر نوشاہی کی اس کتاب کے اوراق کیا ہیں، گویا ہمارے ماضی کی کتاب کے زرّیں ورق ہیں...... سوچتا ہوں کہ آج اقبال زندہ ہوتے تو اِس کتاب کو دیکھ کر کتنے خوش ہوتے؟ یہ دیکھ کر اُن کو کتنا اطمینان ہوتا کہ وسطِ ایشا کے قلب پر جمی ہوئی پپڑی بالآخر ریزہ ریزہ ہو کر رہی۔ (۳۶)

ڈاکٹر عارف نوشاہی فرہنگ مشترک کی تعارفی تقریب میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

میرے خیال کے مطابق ای.سی.او ممالک سے وابستہ ہر فرد جو اپنی زبان اور اپنی ثقافت سے دلچسپی رکھتا ہے، اس کتاب کا ہر صفحہ اس کے لیے لذت بخش اور باعث فخر ہے۔ جب وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی زبان کا لفظ وہی معنی رکھتا ہے جو اس سے ہزاروں میل دور کسی ملک کے اندر ہے، وہ اس ملک کے ساتھ قربت اور ہم آہنگی کا احساس کرنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس کتاب کو ای.سی.او.

ممالک کے درمیان ہم آہنگی اور وصل کا ایک نقطہ سمجھتے ہیں۔ (۳۷)

فرہنگ مشترک ایک عمدہ تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس کی تالیف واقعی بہت مشکل کام تھا۔ لیکن ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اپنے وسیع محققانہ تجربے کی بنا پر اسے انتہائی احسن طریقے سے انجام دیا۔ فرہنگ مشترک کی تیاری اور طریق کار کے بارے میں پروفیسر نظیر صدیقی لکھتے ہیں:

> فرہنگ مشترک کی تیاری میں جو طریقہ اختیار کیا وہ یہ ہے کہ انھوں نے ہر صفحہ پر ایک جدول بنائی ہے، جس کے ہر خانے میں انھوں نے دائیں سے بائیں پاکستان سے شروع کرتے ہوئے اور کرغستان پر ختم کرتے ہوئے پہلے ملکوں کے نام لکھے ہیں، پھر وہ اوپر سے نیچے الفبائی ترتیب میں مشترک الفاظ لکھتے چلے گئے۔ آخری ملک کے نام کے بعد ایک مزید خانہ ہے، جس میں ہر لفظ رومن رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔ (۳۸)

۹۔ ڈاکٹر جمیل جالبی: ایک مطالعہ

یہ کتاب ۱۹۹۳ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع ہوئی۔ اِس میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے ادبی کارناموں سے متعلق مضامین شامل ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی بیک وقت محقق، نقاد اور ادبی مورّخ کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کی تحقیق میں ژرف نگاہی اور تنقید میں گہری بصیرت کا عنصر ملتا ہے۔ انھوں نے ادب کو نئی جہتیں عطا کیں ہیں اور کلچر کو معنویت بخشی ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی اس کتاب کی تالیف کی وجہ یوں بیان کرتے ہیں:

> زیرِ نظر کتاب کی تدوین کا مقصد ڈاکٹر جمیل جالبی کی علمی و ادبی خدمات کو ایسے زاویے سے منظرِ عام پر لانا ہے جس سے ان کے کام کی مجموعی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے کام کی کئی جہتیں ہیں...... یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کے علمی، تحقیقی اور ادبی کام کا اجمالی جائزہ ہے...... میں نے مقدور بھر کوشش کی ہے کہ ایک بڑے اور بھرپور مصنف کی تمام جہتوں کو زیرِ مطالعہ لا کر اس کی شخصیت اور جذبات کی ایسی تصویر قارئین کے سامنے پیش کر دی جائے جس میں وہ اپنی حقیقی اور اصلی حیثیت سے سامنے آ سکیں۔ (۳۹)

کتاب کو گیارہ عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔ ہر عنوان سے متعلق چند مضامین، جو

مختلف ادبا نے تحریر کیے تھے، اکٹھے کر دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی کے سوانحی کوائف درج کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی تقریباً ٦٦ تصاویر شائع کی گئی ہیں۔ پہلے باب میں شخصیت کے عنوان سے بارہ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ دوسرا باب ''دورنِ خانہ'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں جمیل جالبی کے اہلِ خانہ کے تاثرات درج ہیں۔ اسی طرح اگلے ابواب بالترتیب بحیثیت نقاد، بحیثیت محقق، جمیل جالبی بحیثیت ادبی مورّخ، بحیثیت کلچر شناس، بحیثیت لغت نگار، بحیثیت بچوں کا ادیب کے عنوانات سے پیش کیے گئے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کی تالیف ہے۔ زیرِ نظر کتاب پر ڈاکٹر حبیب نثار اپنی رائے کا اظہار اِس طرح کرتے ہیں:

> ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اپنی تالیف ڈاکٹر جمیل جالبی: ایک مطالعہ میں جمیل جالبی کے ہر ادبی پہلو کو سمویا ہے اور اس طرح ایک ہی تصنیف میں ڈاکٹر جمیل کی تمام جہتوں کا بہ یک نظر تعارف ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کے مؤلف یقیناً قابلِ ذکر ہیں۔ (۴۰)

جمیل جالبی: ایک مطالعہ پر انور فیروز **نوائے وقت** میں تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی یہ کتاب ایک گلدستہ ہے، جس میں مختلف پھولوں کی خوشبو ہے۔ کتاب کی نمایاں خاصیت یہ ہے کہ اس میں ڈاکٹر جمیل جالبی کو محض ممدوح بنانے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ ان کے افکار اور علمی خدمات کا غیر جانبداری اور علمی دیانت سے جائزہ لیا گیا ہے۔ یقیناً یہ بہت اچھی کتاب ہے اور کتاب کے مؤلف ڈاکٹر گوہر نوشاہی اس کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ (۴۱)

جمیل جالبی: ایک مطالعہ کی ترتیب و تالیف میں ڈاکٹر صاحب سے کچھ فروگزاشتیں بھی سرزد ہوئی ہیں، جن کی نشان دہی ڈاکٹر حبیب نثار نے بھی کی ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

- ڈاکٹر خلیق انجم مذکورہ کتاب کے صفحہ ۱۷ پر جالبی صاحب کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان چلے گئے۔'' ص ۳۷ پر انور عالم صدیقی لکھتے ہیں: ''جالبی صاحب ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان پہنچ گئے۔'' ان دونوں باتوں کے مابین موجود تضاد کو دور کرنا مؤلفِ کتاب کی ذمہ داری تھی، لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔

- ڈاکٹر سلیم اختر ص ۱۹۵ پر اپنے مضمون میں رقم طراز ہیں: ''ڈاکٹر جمیل جالبی کو متوازن نقاد سمجھتا ہے۔'' یہاں یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ کون ایسا سمجھتا ہے۔ اس جملے کی اصلاح مؤلفِ کتاب نے نہیں کی۔
- ڈاکٹر گوہر نوشاہی ص ۲۳۵ پر جمیل جالبی کے تحقیقی سفر کے آغاز کے بارے میں لکھتے ہیں: ''ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے تحقیقی سفر کا آغاز تین موضوعات سے کیا۔'' لیکن پورے مضمون میں ان تین موضوعات کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اس طرح ان کا دعویٰ بے دلیل ہو کر رہ گیا ہے۔
- مثنوی کدم راؤ پدم راؤ پر مشفق خواجہ اور ڈاکٹر وحید قریشی نے تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ مشفق خواجہ ص ۲۵۳ پر لکھتے ہیں کہ ''جالبی صاحب نے اس مثنوی پر تقریباً سات برس کام کیا ہے۔'' ص ۲۵۹ پر ڈاکٹر وحید قریشی جالبی صاحب کے اس کام کو پانچ سال کی محنت کا ثمر گردانتے ہیں۔ اس تضاد کو دور کرنا بھی مؤلفِ کتاب کا فرض تھا جس سے اغماض برتا گیا ہے۔ مندرجہ بالا خامیوں کے باوجود ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا کام عمدہ ہے۔ (۴۲)

۱۰۔ مطالعہ اقبال

مطالعہ اقبال بزمِ اقبال، لاہور سے مئی ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی اس کا پیش لفظ سیکرٹری بزمِ اقبال محمد جہانگیر خان نے قلم بند کیا ہے۔ اور اس کا دیباچہ مؤلف کتاب یعنی ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے تحریر کیا ہے۔ اس کتاب میں اقبال کی حیات اور افکار کے موضوع پر لکھے گئے وہ مقالات شامل ہیں جو ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۰ء تک کے درمیانی عرصہ میں مجلہ اقبال میں شائع ہوتے رہے۔ اس کے دیباچے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں:

> مقالات کا انتخاب کرتے ہوئے دو باتیں بالخصوص میرے پیشِ نظر رہیں۔ اوّل یہ کہ اس میں صرف ایسے مقالات شامل ہوں جنھیں اقبالیات کے تحقیقی اور تنقیدی مطالعے میں اہم کڑیوں کا درجہ حاصل ہے۔ دوم یہ کہ ان مقالات میں صحیح مصادر اور قابلِ اعتماد حوالوں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہو۔ میں نے اقبالیات کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے اس انتخاب میں قارئین کے ذوق کو پوری طرح مدِنظر رکھا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اقبال کی حیات وشاعری کے مطالعے میں یہ

کتاب سود مند ثابت ہوگی۔ (۴۳)

اس کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں اقبال کے حالاتِ زندگی سے متعلق تحقیقی مقالات شامل ہیں۔ دوسرے حصے کا عنوان ''مباحث'' ہے اور تیسرے حصے کا عنوان ''تنقید'' ہے۔ اس حصے میں اقبال کے فکر وفن پر تنقیدی مقالات شامل ہیں۔ اور اس کتاب کے آخری حصے کا عنوان ''نوادر'' ہے۔ اس حصے میں اقبال کے دو اہم اور غیر مدوّن خطوط شامل ہیں۔ اس کے پیش لفظ میں محمد جہانگیر خان رقم طراز ہیں:

> مطالعہ اقبال میں شامل مقالات کی اہمیت کے متعلق نہ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ گزشتہ اٹھارہ برس میں مجلہ اقبال میں شائع ہونے والے مقالات کا بہترین انتخاب ہے بلکہ یہ بات بھی بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ گزشتہ ربع صدی میں اقبالیات کے موضوع پر جو تحقیقی اور علمی کام مقالات کی صورت میں ہوا ہے یہ انتخاب اس کی کما حقہ نمائندگی کرتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ کتاب اقبالیات کے مطالعہ میں اہم کردار ادا کرے گی۔ (۴۴)

۱۱۔ سیّد امتیاز علی تاج شخصیت اور فن

یہ کتاب ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی تالیف ہے۔ اِسے اکادمی ادبیات کے ادبی و تحقیقی منصوبے ''پاکستانی ادب کے معمار'' کے تحت ۱۹۹۹ء میں شائع کیا گیا۔ اس کا پیش لفظ خالد اقبال یاسر نے تحریر کیا ہے۔ کتاب کی اشاعت کے بارے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی ''بقلم خود'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

> مجھے تاج صاحب کے ساتھ کئی سال بطور ہمکار کام کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان کی شخصیت اور فکر وفن پر میرے پاس اس قدر معلومات ہیں کہ زیر نظر کتاب کے لیے اُن سے انتخاب میرے لیے ایک امتحان سے کم نہ تھا...... سیّد امتیاز علی تاج کی ادبی فتوحات کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ انھیں یکجا کرنے کے لیے بہت وقت درکار ہے...... زیر نظر کتاب میں ''مطالعہ تاج'' کے لیے ایک مکمل اور بھر پور خاکہ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ (۴۵)

یہ کتاب سیّد امتیاز علی تاج کی شخصیت کے بارے میں اہم تحقیقی دستاویز ہے۔ ڈاکٹر گوہر

نوشاہی کے سیّد امتیاز علی تاج سے اچھے مراسم تھے۔ خصوصاً مجلسِ ترقیِ ادب میں سیّد صاحب نے گوہر نوشاہی کی علمی، ادبی اور معاشی معاونت میں اہم کردار ادا کیا۔ اس لحاظ سے امتیاز صاحب گوہر نوشاہی کے محسن و مربی ٹھہرتے ہیں۔ گوہر نوشاہی نے بھی اس کتاب میں انتہائی محنت اور جانفشانی سے اپنا فرض نبھایا ہے۔ اس کتاب کا فارسی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ ترجمہ ادارہ خانہ فرہنگ جمہوری ایران، کراچی کی طرف سے کیا گیا ہے۔ اس ترجمے کو اکادمی ادبیات پاکستان نے ۱۹۹۱ء میں شائع کیا تھا۔

۱۲۔ ڈاکٹر وحید قریشی شخصیت اور فن

یہ کتاب اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد نے ۲۰۰۶ء میں شائع کی تھی۔ اس کا پیش نامہ مختصر مگر جامع انداز میں جناب افتخار عارف نے تحریر کیا ہے اور اس کا پیش لفظ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے لکھا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی گوہر نوشاہی کے استاد اور محسن ہیں۔ زیرِ نظر کتاب گوہر نوشاہی کی ڈاکٹر وحید قریشی سے عقیدت کی غماز ہے۔ گوہر نوشاہی نے بڑے محققانہ انداز میں وحید قریشی کی شخصیت اور فن پر بحث کی ہے۔ ان کی شخصیت اور فن کے کئی پوشیدہ گوشوں کو اُبھارا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے بارے میں بہت سی معلومات، جو بکھری پڑی تھیں، انھیں نہ صرف یکجا کر دیا ہے بلکہ اُن میں مزید اضافے بھی کیے ہیں۔ یہ کتاب ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے تحقیقی، تنقیدی اور تاریخی شعور کی عکاس ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی اس کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر وحید قریشی ایک نامور محقق اور ممتاز دانش ور ہیں۔ ان کی علمی اور ادبی خدمات کی لاتعداد جہتیں ہیں، جنھیں محدود اوراق کی تنگنائے میں سمونا آسان نہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں ان کی ہمہ جہت شخصیت اور بلند پایہ علمی خدمات کی محض ایک جھلک پیش کی گئی ہے۔ (۴۶)

ڈاکٹر وحید قریشی کی علمی شخصیت دنیائے تحقیق کے لیے ایک مینارۂ نور ہے۔ وہ ممتاز دانشور، محقق اور مترجم ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ پائے کی تخلیقی صلاحیتیں بھی لیے ہوئے ہیں۔ ان کی زندگی جہانِ فکر و دانش کے در و بام تعمیر کرتے گزری ہے۔ وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے ڈاکٹر وحید قریشی کی شخصیت کے اہم گوشوں سے متعارف کروانے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کے پیش نامے میں افتخار عارف لکھتے ہیں:

ڈاکٹر وحید قریشی کی زندگی اور ادبی خدمات کے حوالے سے پیشِ نظر کتاب ملک کے معروف محقق اور نقاد ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے بڑی توجہ اور محنت کے ساتھ تحریر کی ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی یہ کتاب ڈاکٹر وحید قریشی کی شخصیت اور فن کے بعض اہم گوشوں سے متعارف کرانے اور ان کے کام کو سمجھنے، سمجھانے میں یقیناً معاون ثابت ہوگی۔ (۴۷)

۱۳۔ ڈاکٹر وحید قریشی، سوانحی کتابیات

اکادمی ادبیات کی چھپی ہوئی کتاب ڈاکٹر وحید قریشی: شخصیت اور فن اسی سوانحی کتاب کا ایک تسلسل ہے۔ اسے ادارۃ المعارف، لاہور نے شائع کیا۔ اس میں ڈاکٹر وحید قریشی کی اُردو کتب اور مقالات کی فہرست کے ساتھ ایک مختصر سوانحی پیش لفظ شامل ہے۔

۱۴۔ تحقیقی تناظر (زیر طبع)

تحقیقی تناظر ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی تحقیقی تصانیف میں زیر طبع کتاب ہے۔ یہ طباعت کے مختلف مراحل طے کرنے کے بعد امید ہے جلد منظرِ عام پر آجائے گی۔ اس کتاب کو درج ذیل عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ تذکرہ حضرت شاہ دولہ گجراتی۔

۲۔ قیام پاکستان پر ایک محنت کش کا روزنامچہ۔

۳۔ فرہنگ مشترک۔

۴۔ واسع باری۔

۵۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی اور عشقِ رسولؐ۔

۶۔ لاہور کے چشتی خاندان کی اُردو خدمات۔

۷۔ پروفیسر حمید احمد خان احول و آثار پر ایک نظر۔

۸۔ ڈاکٹر وحید قریشی سوانح و شخصیت۔

۹۔ اُردو میں سائنسی ادب کی روایت۔

۱۰۔ ۱۹۹۷ء کا متفرق ادب ایک جائزہ۔

یہ مقالات، جس طرح عنوانات سے ظاہر ہے، تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر

صاحب کا روشِ تحقیق دیگر تصانیف کی طرح اپنے معیار کا نشان گر ہے۔ پہلا مقالہ گجرات کے معروف صوفی بزرگ حضرت شاہ دولہ کے بارے میں ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے سوانح شاہ دولہ کے بارے میں ایک فارسی مخطوطہ دریافت کیا تھا جسے انھوں نے بہت احتیاط سے اور علمی معیار کے مطابق مرتب کیا ہے۔ یہ مقالہ اس کتاب کا مقدمہ ہے۔ مقالے میں حضرت شاہ دولہ کے بارے میں قدیم و جدید تحقیق کی نشاندہی کی گئی ہے اور مخطوطے میں درج سوانح حضرت شاہ دولہ کے مصنف چراغ بن شاہ مراد کے کام کو شرح و بست کے ساتھ قارئینِ ادب سے روشناس کرایا ہے۔ یہ کتاب اڑھائی سو صفحات پر مشتمل ہے۔

''واسع باری'' اس کتاب کا چوتھا مضمون ہے۔ ''واسع باری'' مولوی احمد بخش یکدل لاہوری کی ایک مثنوی ہے جو خالق باری کی طرز پر درسی ضروریات کے لیے تصنیف ہوئی تھی، جس کا خطی نسخہ خود مصنف کے قلم سے لکھا ہوا ہے، خوش قسمتی سے دست بردِ زمانہ سے محفوظ رہا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے یہ متن دریافت کیا اور اس پر ایک مفصّل تعارف لکھا جو مجلسِ ترقیِ ادب کے جریدے صحیفہ میں شائع ہوا۔ یہ مقالہ اسی مقدمے پر مشتمل ہے۔ لاہور کے چشتی خاندان کی اُردو خدمات، اس عنوان کے تحت ڈاکٹر صاحب کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا مقدمہ ہے۔ اس مقالے پر بحث پچھلے صفحات میں آچکی ہے۔ آٹھواں مضمون ڈاکٹر وحید قریشی سوانح اور شخصیت ہے جو زیرِ نظر کتاب سے پہلے ڈاکٹر وحید قریشی کے اعزاز میں شائع ہونے والی کتاب ارمغانِ علمی مرتبہ ڈاکٹر عارف نوشاہی، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر تحسین فراقی، میں شائع ہو چکا ہے یہ کتاب القمر انٹر پرائزز، لاہور نے شائع کی تھی۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی ایک ممتاز دانشور اور محقق ہیں۔ اُن کی تحقیقی خدمات آپ اپنا تعارف ہیں۔ ان کی مختلف تحقیقی خدمات کا جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ گوہر نوشاہی نہ صرف دبستانِ لاہور کی تحقیقی روایت کے امین ہیں بلکہ اس روایت کو آگے بڑھانے میں بھی ان کا اہم کردار ہے۔ دبستانِ لاہور نے اُردو تحقیق میں حزم و احتیاط، ثابت قدمی اور خود احتسابی کے رویوں کو فروغ دیا۔ دبستانِ لاہور کے اہم ناموں میں حافظ محمود شیرانی، مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر سیّد عبداللہ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر مشفق خواجہ کے نام نمایاں ہیں۔ ان بزرگوں نے تحقیق میں معیار کو اوّلیت دی، سہل انگاری کے بجائے ریاضت کو اپنایا اور کئی مسلمہ ادبی مفروضوں کی بے رحمانہ چھان بین کی اور تحقیق

میں حزم واحتیاط کا دامن تھامے رکھا۔ان محققین کے بعد کی نسل نے سچی لگن اور جانکاہی میں نام پیدا کیا۔ان میں ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر نجم الاسلام، ڈاکٹر اکرام چغتائی، ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور ڈاکٹر گوہر نوشاہی قابلِ ذکر ہیں۔ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی تمام زندگی کارزارِ تحقیق میں گزری ہے۔ڈاکٹر اعجاز راہی ان کی ادبی خدمات کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں:

> تحقیق ایک خاصا مشکل کام ہی نہیں کل وقتی Devotion بھی چاہتی ہے......
> ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے نہ صرف عین جوانی میں ''کارِ پیری'' کو اپنایا بلکہ ساری زندگی وفاداری کے ساتھ گزار دی۔ (۴۸)

پنجاب میں اُردو تحقیق کی وہ روایت جو حافظ محمود شیرانی، مولوی محمد شفیع اور ڈاکٹر سیّد عبداللہ سے ہوتی ہوئی ڈاکٹر وحید قریشی تک پہنچی، ڈاکٹر گوہر نوشاہی اسی روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے اُردو تحقیق میں خاطر خواہ اضافے کیے اور اس روایت کو مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔پنجاب میں اُردو زبان وادب کے علاوہ اگر مجموعی حیثیت سے غیر جانبدارانہ جائزہ لیا جائے تو تاریخ اُردو ادب بھی اُن کے تحقیقی کاموں کی احسان مند ہے۔غالب کے کلام اور سوانح پر اُن کا تحقیقی کام بہت اہمیت کا حامل ہے۔غالب کے علاوہ اقبال اور سر سیّد کے حوالے سے اُن کا تحقیقی کام اُردو ادب میں اہم اضافہ ہے۔ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے مفروضات کی بجائے حقائق پر مبنی تحقیق کی بنیاد ڈالی ہے۔اُن کی تحقیق میں ژرف نگاہی، دیدہ ریزی، وسعت نظری اور عمیق مطالعے کا عنصر نمایاں ہے۔

چوتھا باب

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی تدوینی خدمات

متن اور روایتِ متن

متن ایسی عبارت یا تحریر کو کہتے ہیں جسے پڑھا جا سکے، یعنی مصنف کے اصل الفاظ اور کتاب کی اصل عبارت۔ اس کے علاوہ پرانے دور کی وہ تحریریں جو ہاتھی دانت، چمڑے کے ٹکڑوں، پتھر کی سلوں یا پکی مٹی کی لوحوں پر موجود ہوں اور پڑھی جا سکتی ہوں متن کہلائیں گی۔ متن کو عموماً دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ اصل متن

۲۔ اضافی متن

اضافی متن میں متن کے ساتھ شامل کی گئی تشریحی اور توضیحی انداز کی عبارتیں شامل ہوتی ہیں، جو خود صاحبِ متن اور اس کے بعد کے لوگوں نے لکھی ہوتی ہیں۔ ان کے ساتھ مصنف کے اپنے یا اس کے قریبی دور کے تعلیقے بھی اضافی حیثیت رکھتے ہیں۔ اضافی متن کی یہ تمام صورتیں بعض اوقات اصل متن کی تفہیم کے لیے بہت ضروری ہوتی ہیں۔ اِن کے علاوہ کچھ املائی متن بھی ہوتے ہیں، یعنی ایک شخص بولتا جاتا ہے اور دوسرا لکھتا جاتا ہے۔ اب اگر لکھنے والا جو کچھ سنتا ہے اُسے اُسی طرح لکھتا بھی جاتا ہے تو اِسے ''تقلیدی متن'' کہا جائے گا۔ اور اگر لکھنے والا اپنی سوجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے الفاظ کو پس و پیش اور مضمون کو کم و بیش کر کے لکھتا ہے تو اسے ''نیم تقلیدی'' متن کہا جائے گا۔ بعض متون سماعی بھی ہوتے ہیں۔ ایسے متن صدیوں تک سینہ بہ سینہ ہوتے ہوئے تحریری صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ کچھ متون ایسے بھی ہوتے ہیں جو بہت سے افراد کی تالیف یا تخلیق ہوتے ہیں، جن کا زمانہ بہت طویل عرصہ پر محیط ہوتا ہے۔ ایسے متون میں وقت کے

ساتھ ساتھ ترامیم اوراضافے ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح اصل وفرع میں بہت فرق آجاتا ہے۔ اس صورت میں قدیم قلمی نسخوں کو ترجیح دینا ضروری ہوتا ہے۔ معلومہ قلمی نسخوں میں اہم قلمی نسخوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ معلومہ قلمی نسخوں میں سب سے اہم قلمی نسخہ وہ ہوتا ہے جو خود مؤلف کے قلم سے لکھا گیا ہو اور جس کے بارے میں داخلی و خارجی شہادتیں بھی موجود ہوں وہ ''اساسی متن'' کا درجہ رکھتا ہے۔ دوسرے نمبر پر ایسے قلمی نسخے آسکتے ہیں جو مصنف کی نظر سے گزر چکے ہوں۔ انھیں استنادی متن کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ ''استنادی متن'' میں وہ قلمی نسخے آتے ہیں جن کو مصنف کے ایما پر اس کے دوست یا کسی دوسرے جاننے والے شخص نے تیار کیا ہو۔ اس امر کی تصدیق کرنے کے لیے کہ وہ قلمی نسخہ واقعی مصنف کی نظر سے گزرا ہے یا اس کے ایما پر تیار کیا گیا ہے، بہت احتیاط اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کبھی خود مصنف غیر ارادی یا اضطراری طور پر کچھ سے کچھ لکھ جاتا ہے، جو اس کا مقصد نہیں ہوتا۔ یہی صورت کاتب کے ساتھ بھی پیش آسکتی ہے۔ بعض اوقات نظر ثانی کی نوبت بھی نہیں آتی اور اس طرح ''اساسی متن'' میں غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے غلطیوں کے امکانات ہوتے ہیں۔ اِن کی مختلف وجوہ ہوسکتی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی رقم طراز ہیں:

> کہیں یہ ''خامہ غلط نگار'' کی روش کا ''رہ آورد'' ہوتی ہیں۔ کبھی املائی صورتوں کی مشابہت اس کا سبب بنتی ہے، کبھی متوازی ہیئت یا لفظ کی معنوی مناسبت ذہن کو اس طرف مائل کرتی ہے۔ کبھی لاعلمی، تساہل اور کم نظری کے سبب سے ایسا ہوتا ہے اور کبھی دیدہ و دانستہ عبارت میں قطع و برید کرکے اپنے خاص عقیدے، خیال اور مقصد کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے۔ کبھی اس طرح کی کوئی تبدیلی عوام کی زبان پر جاری و ساری متن میں نامعلوم طور پر ہو جاتی ہے۔ کبھی غلطی خود روایت نگار کرتا ہے اور کبھی وہ کسی دوسری روایت یا نسخے سے ماخوذ ہوتی ہے۔ جس کے باعث یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک ہی قسم کی تبدیلی یا غلطی ایک سے زیادہ روایتوں میں ملتی ہے۔ (۱)

مختلف اقسام کی متنی تبدیلیوں کو مختلف شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

ترمیم: نامعلوم اسباب کے تحت ہونے والی تبدیلیاں جو سہوِ نظر یا لغزشِ قلم کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

تعبیر: وہ تبدیلیاں جو مبہم لفظ کی وضاحت کے لیے کسی عبارت کو بڑھانے سے پیدا ہوتی ہیں۔
تنسیخ: بعض اوقات جان بوجھ کر کسی متن یا اجزائے متن کو منسوخ کیا جاتا ہے۔ ایسی تبدیلیاں تنسیخ کے زمرے میں آتی ہیں۔
تصحیح: یہ ایسی تبدیلیاں ہوتی ہیں جو صاحبِ متن خود اپنی خواہش اور مقصد کے پیشِ نظر کرتا ہے۔
تصحیف: ایسی تبدیلیاں جو صاحبِ متن کے علاوہ کسی دوسرے شخص نے جان بوجھ کر کی ہوں۔
غلط انتساب: غلط انتساب کی کئی وجوہ ہوسکتی ہیں۔ کبھی کوئی مصنف خود اپنی تصنیف اپنی مرضی اور خواہش کے باعث ازراہِ عقیدت و خلوص کسی دوسرے شخص کے نام کر دیتا ہے۔ اور کبھی نقل بردار کی لاعلمی کی وجہ سے ایسا ہو جاتا ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کہاں کس نوعیت کی غلطی موجود ہے، غیر معمولی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ترتیبِ متن کا بنیادی مقصد ہی عبارت کی صحیح قرأت کا تعین ہے۔ ڈاکٹر تنویر علوی لکھتے ہیں:

ترتیبِ متن کا اساسی مقصد ہی عبارت کی صحیح قرأت کا تعین، اجزائے عبارت کی صحیح ترتیب اور اس کے وسیلے سے کسی روایت کو اس کی صحیح شکل میں پیش کرنا ہے۔ اس میں اس کی زبان، اس کے ترکیبی اجزا اور اس کا املا بھی باتیں شامل ہیں۔ قدیم متون کی صورت میں الفاظ کے قدیم املا کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں بھی مصنف کا اپنا املا مرجح حیثیت رکھتا ہے۔ یہ املا متن کی صوری ہیئت کا ایک لازمی جزو ہوتا ہے۔ (۲)

متن کی اصلی اور درست صورت وہی قرار دی جاتی ہے جسے صاحبِ متن نے خود پیش کیا ہو۔ اگر اصلی شکل میں مصنف کا اپنا قلمی مسودہ مل جائے اور اِس بات کی تصدیق بھی ہو جائے کہ یہ صحیح ہے تو اسے اصل متن قرار دینا چاہیے۔ لیکن یہاں ایک اور بات قابلِ غور ہے کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ مصنف کے قلم سے ایک سے زیادہ لکھے ہوئے مسودات دستیاب ہو جائیں تو ایسی صورت میں سب سے آخری مسودہ کو مستند قرار دینا چاہیے۔ اگر ایک سے زیادہ قلمی نسخے اور مطبوعہ ماخذ موجود ہوں تو ان کے زمانۂ تحریر کا تعین داخلی اور خارجی شہادتوں کی مدد سے کیا جائے گا۔ اس طرح تصحیحِ متن کا کام قدیم قلمی یا مطبوعہ نسخوں کے تقابلی مطالعے کی روشنی میں کیا جائے گا۔ اس عمل کے لیے مصنف اور مصنف کے زمانے کے رسم الخط، زبان املا اور تلفظ سے متعلق علمی سطح پر واقفیت

کا ہونا ضروری ہے۔

اُردو تدوین کا آغاز اور روایت

اُردو میں تدوینِ متن کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی میں ہوتا ہے۔ البتہ اس سے پہلے انیسویں صدی میں تدوین پر کچھ کام ہوا۔ انیسویں صدی میں نول کشور کے چھاپہ اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے کچھ متون شائع کیے لیکن یہ متون تدوین کے جدید سائنٹفک اصولوں پر پورا نہیں اترتے، حتیٰ کہ سرسیّد کی آئینِ اکبری اور محمد حسین آزاد کا مرتبہ دیوانِ ذوق بھی تدوین کے اصولوں کے مطابق نہیں۔ ان کے علاوہ کچھ معروف شعرا کے دواوین بھی ترتیب دیے گئے لیکن اِن میں بھی مرتبین کی کوتاہیاں شامل ہیں۔

بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں انجمن ترقی اُردو (ہند) نے اس جمود کو توڑ دیا۔ انجمن کے زیرِاہتمام تدوینِ متن پر کام ہوا۔ انجمن نے شعرا کے دواوین اور تذکرے شائع کیے۔ اس سلسلے میں خاص طور پر مولوی عبدالحق کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن افسوس! مولوی صاحب نے بھی ترتیب، تدوین کے سائنٹفک اصولوں کی طرف خاص توجہ نہ دی۔ بیسوی صدی میں مولوی عبدالحق کے علاوہ حافظ محمود شیرانی، مولانا امتیاز علی عرشی، پروفیسر محی الدین قادری زور، پروفیسر مسعود حسن خان، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر ظہیر الدین مدنی، پروفیسر اکبرالدین صدیقی، مالک رام، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، رشید حسن خاں اور دوسرے متعدد محققین نے قدیم اُردو کے متون مرتب کیے۔ ترتیبِ متن ایک سائنٹفک اندازِ نظر ہے۔ اس میں قیاس آرائی سے کام نہیں چلتا، ہر بات کے لیے ٹھوس حوالے اور ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ متنی نقاد کا بنیادی فریضہ سائنسی انداز میں متن کی غلطیوں کا ازالہ کرنا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر خلیق انجم کی کتاب متنی تنقید کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> متنی نقاد کا کام دراصل نقل نویس اور کاتب کی غلطیوں کا ازالہ کرنا ہے۔ یہ غلطیاں کہیں لغزشِ قلم، کہیں لغزشِ گوش اور لغزشِ چشم کی وجہ سے سرزد ہوئی ہیں۔ یہ غلطیاں اس وجہ سے نہیں ہوئیں کہ رسم الخط میں کوئی خاص خرابی ہے بلکہ یہ غلطیاں یونانی، لاطینی، فارسی اور اُردو کے سبھی کاتبوں نے کی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہاتھ کے لکھے ہوئے دو یکساں نسخے ملنا اگر ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ (۳)

تصحیحِ متن اور تدوینِ متن پر پاکستان اور ہندوستان ہر دو ملکوں میں اہم کام ہوا ہے۔ ہندوستان میں اہم نام مولانا امتیاز علی عرشی، پرتھوی چندر، مالک رام، نصیر الدین ہاشمی، نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ہندوستان کے محققین کا کام بہت اہم ہے لیکن صرف اُن نسخوں کے حوالے سے جو اُن کی دسترس میں تھے۔ پاکستان میں موجود نسخے اور مسودات اُن کی نظر سے اوجھل رہے اس لیے اُن کے کام میں تھوڑی سی خامی رہ گئی۔ تصحیحِ متن کے حوالے سے پاک سرزمین سے تعلق رکھنے والے اہم محققین میں حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر سیّد عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سخاوت مرزا، مشفق خواجہ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر نجم الاسلام، خلیل الرحمٰن داؤدی، کلب علی خاں فائق رام پوری اور ڈاکٹر گوہر نوشاہی قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے چند ایک محققین کے علاوہ باقی تقریباً تمام کا تعلق کسی نہ کسی طرح دبستانِ لاہور سے ہے۔ اُردو تحقیق کی جو روایت حافظ محمود شیرانی سے ہوتی ہوئی ڈاکٹر وحید قریشی تک پہنچی، ڈاکٹر گوہر نوشاہی اسی روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی ایک منصوبہ بند، کثیر المطالعہ اور مخطوطہ شناس محقق ہیں۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی تدوین

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا بنیادی کام سوانحی تحقیق اور متنی تحقیق ہر دو حوالوں سے ہے۔ سوانحی تحقیق میں انھوں نے شعرا کے تذکروں سے استفادہ کیا ہے۔ دراصل تذکرے کلاسیکی ادب کا بنیادی مآخذ ہیں۔ اِن مآخذ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے انھوں نے بہت محنت کی اور تحقیقی نتائج اخذ کیے۔ اِن کا دوسرا کام تصحیحِ متن کے حوالے سے ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، تہمینہ نذیر کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> میرا بنیادی کام سوانحی تحقیق اور متنی تحقیق دونوں کے سلسلے میں ہے۔ سوانحی تحقیق میں مَیں نے شعرا کے تذکروں سے بھرپور استفادہ کیا...... میرا دوسرا کام تصحیحِ متن کا ہے...... میں نے کسی ایسے متن پر کام نہیں کیا جس کے متعدد نسخے میرے سامنے نہ تھے۔ (۴)

متن کی تصحیح میں مختلف نسخوں کے استعمال میں انھوں نے ہمیشہ قدیم نسخے کو بنیاد بنایا۔ اُردو تحقیق میں دو رویے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک رویہ تحقیقِ متن کا ہے اور دوسرا تصحیحِ متن کا۔ تحقیقِ

متن سے مراد یہ کہ محقق جس متن پر کام کر رہا ہے، اس کے بارے میں اسے مکمل معلومات ہونی چاہئیں۔ نسخوں کی تعداد، کاغذ، خط وغیرہ سے متعلق صحیح معلومات کا حصول اشد ضروری ہوتا ہے۔ تصحیحِ متن سے مراد یہ ہے کہ محقق مختلف اور مستند نسخوں کی مدد سے متن کی صحت کا اہتمام کرے، اُسے مصنف کی منشا کے قریب ترلانے کی کوشش کرے۔ سوانحی تحقیق اور متنی تحقیق دونوں بہت مشکل کام ہیں۔ تصحیح متن اور تحقیقِ متن بہت ذمہ داری اور احتیاط کا کام ہے۔ جب ایک نسل سے دوسری نسل تک کوئی ادب پارہ منتقل ہوتا ہے تو اس کی تصحیح بہت ضروری ہوتی ہے۔ ورنہ ایک غلطی آگے سے آگے منتقل ہوتی چلی جائے گی۔ اس سلسلے میں ہمارے محققین، تذکرہ نویس اور اہلِ علم اگر محنت نہ کرتے تو آج ولی دکنی، قلی قطب شاہ اور دیگر پرانے شعرا کا کوئی دیوان بھی صحیح حالت میں ہمارے سامنے نہ ہوتا۔ تحقیقِ متن کے لیے دو باتوں کا ادراک بہت ضروری ہوتا ہے، ایک تاریخ ادب اور دوسری روایتِ متن۔ تاریخِ ادب کی تدوین نقاد کا نہیں بلکہ محقق کا کام ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، راشد حمید کو روزنامہ نوائے وقت میں انٹرویو دیتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں کہتے ہیں:

> تحقیق کا بنیادی مقصد تاریخ ادب لکھنے میں معاونت کرنا ہے۔ بلکہ تاریخِ ادب صرف محقق ہی لکھ سکتا ہے۔ (۵)

روایت متن سے مراد کسی ادب پارے کو ایک نسل سے دوسری نسل تک اور ایک عہد سے دوسرے عہد تک محنت اور ایمان داری کے ساتھ منتقل کرنا ہوتا ہے۔ تحقیق کا بنیادی منصب اور منشا متن کی صحت ہے۔ یعنی ادب پارے کا صحیح اور درست حالت میں ہونا انتہائی ضروری ہے۔ متن کے اطمینان اور درستی کا مطلب یہ ہے کہ متن زیادہ سے زیادہ منشائے مصنف کے مطابق ہو۔ جب متن کی صحت کا تعین ہو جائے تو پھر بعد میں اس پر تحقیق کا کام شروع ہوتا ہے۔ اس طرح کسی شاعر یا مصنف کے بارے میں صحیح معلومات کا حصول ممکن حد تک یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ جس شخص کو متن کا شعور نہیں ہوتا وہ ذمہ دار محقق نہیں بن سکتا۔ ایک محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ مختلف لسانی تقاضوں اور مختلف زبانوں کے تاریخی اور نامیاتی ارتقا سے خوب واقفیت رکھتا ہو اور ادب کی روایت جانتا ہو۔ اس کے برعکس اگر محقق اِن باتوں سے آگاہ نہ ہو اور صرف کتاب کے نسخوں ہی سے آگاہ ہو تو متن کو درست نہیں کر سکتا۔ ایک محقق کے لیے تصحیح متن کی تیاری کا کام بہت مشکل

مرحلہ ہے۔ اگر متن کے بارے میں معلومات حاصل ہو جائیں اور مصنف کے بارے میں خاطر خواہ معلومات نہ ہوں تو مصنف کی کتاب خود اس کی شخصیت کا مآخذ بن سکتی ہے۔ شاعر یا مصنف ایسی مخصوص لفظیات کا استعمال کرتا ہے جو اس کے ماحول سے مستعار ہوتی ہیں۔ ہر ادب پارہ اپنے عہد کی زبان میں لکھا جاتا ہے۔ مصنف کی تین چار پشت سے وہ الفاظ اِس کے اِرد گرد گھوم رہے ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ ادب پارہ اپنی تہذیب وثقافت سے دور نہیں ہٹتا بلکہ وہ اپنی تہذیب سے کافی حد تک جڑا ہوا ہوتا ہے۔ اس لیے کسی محقق کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ پہلے زبان وادب کی ثقافت اور تاریخ سے خوب واقفیت حاصل کرے اور بعد میں کسی ادب پارے کی تحقیق وتصحیح میں ہاتھ ڈالے۔ اِن کے علاوہ تنقیدی شعور بھی تحقیق کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ ادبی تحقیق کے لیے محقق کا کثیر المطالعہ ہونا بھی از حد ضروری ہے۔ اس کا علمی تجربہ اُسے تدوین وتحقیق میں ممتاز مقام پر فائز کرتا ہے۔ عبدالستار دلوی پروفیسر نذیر احمد کی کتاب تصحیح وتحقیقِ متن کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:

> ادبی تحقیق کے لیے عمیق نظر اور وسیع مطالعہ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ علمی تجربے کو تجزیاتی اور توضیحی پیرایہ بیان میں پیش کرنا تحقیق کا ایک اہم فریضہ ہے۔ اسی سے تحقیق اعتبار کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ (۶)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی تجربہ کار اور کثیر المطالعہ محقق ہیں۔ اِن کی تحقیق میں وسعت نظری، ژرف نگاہی اور عمیق مشاہدے کا عنصر ملتا ہے۔ وہ املا شناسی، خط فہمی اور لفظ بینی میں مہارت رکھتے ہیں۔ وہ تدوین وترتیب میں بہت محنت اور توجہ سے کام لیتے ہیں۔ لفظوں کی مناسب دروبست اور ان کی مختلف صورتوں اور امکانات پر خصوصی توجہ ان کی تحریر اور ان کے تحقیقی مزاج کا اہم وصف ہے۔ اور یہ وصف اُردو متون سازی کی روایت میں کم لوگوں کے ہاں ملتا ہے۔ ڈاکٹر عطش درّانی راقم الحروف کے نام مکتوب میں گوہر صاحب کی تحقیقی صلاحیت اور تحقیق میں ان کی انفرادی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر صاحب عبارت فہمی اور لفظ شناسی میں ایک خاص مہارت رکھتے ہیں۔ خاص طور پر دکھنی دور اور پنجاب سے تعلق رکھنے والے مخطوطوں کو پڑھنا اور قدیم پنجابی کے حوالے سے ان کا فہم پانا ان کا خاصہ ہے۔ (۷)

ڈاکٹر شفیق انجم مراسلہ بنام راقم الحروف میں لکھتے ہیں:

ڈاکٹر گوہر نوشاہی متن کی صحت کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت، حیثیت اور روابط کو بھی مدِ نظر رکھتے ہیں اور جملہ مآخذ سے تقابل، موازنے اور جستجو کو بھی اہم سمجھتے ہیں۔ اُن کے بنائے ہوئے متون میں محض اصل تحریر کی پیش کاری ہی نہیں ملتی بلکہ اس کے متعلقات و امکانات پر تمام موجود شواہد پر تفصیلی بحث بھی ملتی ہے۔ (۸)

تدوینِ متن کے سلسلے میں جمع شدہ متون کو صحت کے ساتھ پوری ایمانداری سے ترتیب و تہذیب کے عمل سے گزارنا ایک مدوّن کے بنیادی فرائض میں شامل ہے۔ اس کام کے لیے تکنیکی صلاحیتیں اور مہارتیں درکار رہوتی ہیں۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے مزاج میں وہ مہارتیں کسی حد تک موجود ہیں۔ ڈاکٹر عبدالغفور شاہ قاسم مراسلہ بنام راقم الحروف میں رقم طراز ہیں:

ڈاکٹر گوہر نوشاہی اُردو کی متنی تحقیق کا سب سے روشن حوالہ ہیں۔ انھیں تحقیقِ متن، تنقیدِ متن، اور تدوینِ متن پر ماہرانہ اور استادانہ دسترس ہے۔ اس ضمن میں ان کا تمام تر کام آنے والے محققین کے لیے ایک بنیادی حوالے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ (۹)

تحقیق و تدوین کے میدان میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے پوری زندگی گزار دی ہے۔ وہ تحقیق کے شعبہ تدوین کی ذمہ داریوں اور مشکلات سے آگاہ ہیں۔ تصحیحِ متن اور تدوینِ متن کا عمل اُن کے نزدیک بہت عظیم الشان اور قابلِ قدر ہے۔ یہاں تک کہ وہ متنی تحقیق و تدوین کا تعلق سنتِ الٰہیہ سے جوڑتے ہیں۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں:

تمام تحقیقی اعمال میں میرے نزدیک تصحیح متن اور تدوین متن کا عمل سب سے عظیم الشان اور قابلِ ذکر ہے۔ متنی تحقیق و تدوین سنت الٰہی سے تعلق رکھتی ہے۔ قرآن مجید کے متن کی تدوین خود ذات باری تعالیٰ نے فرمائی اور اس کی صحت کی ضمانت بھی خود ہی عطا کی۔ (۱۰)

تحقیق و تدوین بہت اہم اور مشکل کام ہے۔ کسی کام کا اس وقت تک حق ادا نہیں ہو سکتا جب تک انسان اپنی توجہ اس پر پوری طرح مرتکز نہ کر دے۔ پھر تحقیق تو ایک ایسا عمل ہے جس میں دوئی کی گنجائش نہیں۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی جس موضوع پر کام کر رہے ہوں، خواہ موضوع کی کوئی

نوعیت ہو، اس کا ہر حوالے سے حق ادا کرتے ہیں اور ممکنہ ذرائع کو استعمال میں لاتے ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم تحقیقی زاویے کے فلیپ پر رقم طراز ہیں:

> گوہر محنت اور دیدہ ریزی سے کام کرتے ہیں۔ چھوٹا سا مقالہ ہو یا پوری کتاب، وہ موضوع کا بھرپور احاطہ کرتے ہیں اور تمام ممکن ذرائع سے مواد فراہم کر کے بہت سلیقے سے پیش کرتے ہیں۔ (۱۱)

پروفیسر نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر گوہر نوشاہی اُردو کے جانے مانے اہلِ علم اور اہلِ قلم ہیں جن کا مطالعہ وسیع ہے۔ ادبی ذوق شائستہ وہ خالص علمی قدر و قیمت کے موضوعات پر محنت اور دقیقہ رسی کے ساتھ لکھتے رہتے ہیں۔ (۱۲)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی تحریر میں ایجاز و اختصار سے کام لیتے ہیں۔ تحقیق کا خواہ کوئی موضوع بھی ہو بات مختصر مگر جامع انداز میں کرتے ہیں اور موضوع کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ اُن کی تحریر بوجھل اور بے کیف نہیں ہوتی، پڑھنے کو دلچسپ محسوس ہوتی ہے۔ پروفیسر مقصود حسنی لکھتے ہیں:

> وہ اپنی تحریروں میں ''رف عمل'' شامل کر کے تحریر کا حجم بڑھانے کے گناہ سے اجتناب کرتے ہیں...... ان کا اندازِ نگارش قاری کو یکسانیت اور گرمی خشکی کے عارضے سے بچالیتا ہے۔ (۱۳)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے کئی نایاب نسخوں اور کتابوں کا کھوج لگا کر انھیں مرتب کیا۔ وہ جس موضوع کو بھی چھیڑتے ہیں، پہلے اس موضوع سے متعلق معلوم مواد اکٹھا کرتے ہیں اور پھر اُس مواد کو کھنگال کر ضروری مواد حاصل کر کے نتیجہ نکالتے ہیں اور مستند حوالوں کے ساتھ اپنے نتائج تحقیق کو پیش کر دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اُن کی تحریروں میں عالمانہ شان نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر گوہر نوشاہی...... علم و تحقیق کے آدمی ہیں اور تحقیق میں بھی تدوینِ متن اُن کا اصل میدان ہے...... اُن کی تحقیق میں عرق ریزی بھی ملتی ہے اور بات کی تہہ تک پہنچنے اور سچائی کے موتی تلاش کرنے کا حوصلہ بھی۔ ان کی تحقیق کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ اپنے موضوع سے متعلق سارا مواد اچھی طرح کھنگالتے ہیں، سارے مآخذ

> سے استفادہ کرتے ہیں اور پھر ان سے ضروری مواد حاصل کر کے اپنے نتائج تحقیق کو مستند حوالوں کے ساتھ دلچسپ ادبی اُسلوب اور مدلّل انداز میں پیش کر دیتے ہیں۔ (۱۴)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے تدوین متن کا زیادہ تر کام مجلسِ ترقیِ ادب سے وابستگی کے زمانے میں انجام دیا۔ مجلسِ ترقیِ ادب نے کلاسیکی ادب کو مرتب کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو اس سلسلے کے تحت ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے مجلس ترقیِ ادب کے لیے بہت سی کتابیں مرتب کیں۔ اُن کا بیشتر کام کلاسیکی ادب پر ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے زیادہ تر کام کلاسیکی ادب پر ہی کیوں کیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلاسیکی ادب معیار کا درجہ رکھتا ہے۔ جس کی روشنی میں نہ صرف تاریخِ ادب ترتیب پاتی ہے بلکہ ہمارے موجودہ ادب کا انحصار بھی کلاسیکی ادب کی روایت پر ہے۔ کلاسیکی ادب تاریخ کا درجہ رکھتا ہے، اور تاریخ کسی بھی موضوع پر کام کرنے کے لیے حافظے کا کام دیتی ہے۔ جس طرح حافظے کے بغیر انسان خود کو ادھورا سا محسوس کرتا ہے اسی طرح کلاسیکی ادب کے بغیر ہمارا ادب بھی ادھورا سا رہتا ہے۔ مجلس ترقی ادب نے تاریخ کی ان کڑیوں کو دریافت کرنے اور ملانے کی کوشش کی جو کافی حد تک فراموش ہو چکی تھیں۔ مجلس نے کلاسیکی ادب کی نئے سرے سے ترتیب و تدوین کی اور نئی ضرورتوں کے پیشِ نظر متون کی تصحیح کا کام انجام دیا۔ پرانے اور نادر متون کو دریافت کر کے شائع کیا جو موجودہ دور میں دستیاب نہ تھے۔ مجلس نے پاکستان اور برصغیر کے دوسرے حصوں میں رہنے والے محققین کو اس اہم کام کی طرف راغب کیا۔ اس طرح بہت سے نایاب متون ہمارے سامنے آ گئے۔ مجلس نے دوسرا کام یہ کیا کہ ان متون پر بلند پایہ علمی و تحقیقی مقدمے لکھوا کر شائع کیے۔ جس سے نہ صرف متون کی اہمیت میں اضافہ ہوا بلکہ ان کی تفہیم بھی آسان ہو گئی۔ مجلس ترقی ادب کے لیے ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا کام نمایاں ہے۔ اب ہم ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی تدوینی خدمات کا ایک ایک کر کے جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔ بیتال پچیسی از مظہر علی ولا

بیتال پچیسی مجلس ترقی ادب کے لیے ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا پہلا تحقیقی کام تھا۔ انھوں نے انتہائی محنت اور لگن سے یہ فریضہ انجام دیا۔ فورٹ ولیم کالج کی کتابیں ہم تک پہنچتے پہنچتے ڈیڑھ سو سال کا سفر طے کر چکی تھیں، اس لیے اس وقت کے املا اور آج کے املا میں خاصا فرق ہے۔ ڈاکٹر

گوہر نوشاہی نے اسے آسان اور نئی ضرورتوں کے مطابق املائی ڈھانچہ عطا کیا۔

بیتال پچیسی میں ہندی اور سنسکرت الفاظ کی کثرت تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کا متن مرتّب کرتے وقت اس کی لغات سازی کی اور جا بجا حواشی لکھے جس سے متن کی تفہیم میں آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بیتال پچیسی کی تدوین میں ایک اور اہم کام یہ کیا کہ بیتال پچیسی کے مصنف مظہر علی ولا اور ان کے معاون ادیبوں شری للو جی لال کوی اور تارینی چرن متر کے مختصر سوانحی حالات بھی لکھ دیے۔ جن سے ان ادبا کے بارے میں بہت عمدہ معلومات فراہم ہو گئیں۔

بیتال پچیسی کے متن کی تصحیح کے دوران میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے بعض الفاظ کی قدیم کتابت کو مروّجہ کتابت میں تبدیل کیا ہے۔ ان میں سے چند تبدیلیاں ملاحظہ فرمائیں:

اصل	موجود	اصل	موجود
بجد	بضد	دھووی	دھوبی
انے	ان نے	بھیکھ	بھیک
کوئے	کوئیں	تروار	تلوار
بواہ	بیاہ	یتن	جتن
توتا	طوطا	وو ہیں	وھیں
سمئیں	سمے	پوے	پاوے

اِن کے علاوہ بھی خاصی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بیتال پچیسی کے متن کی بنیاد اس کتاب کی قدیم ترین اشاعتوں پر رکھی۔ ان میں سے ایک نسخہ انگریزی، ناگری اور اُردو رسم الخط میں تھا۔ بیتال پچیسی دراصل بیتال کی پچیس کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ان کہانیوں کا شجرہ قدیم کلاسیکی کتابوں کتھا سرت، برھت کتھا منجری سے جا ملتا ہے۔ یہ کتابیں سنسکرت میں اپنا اہم مقام رکھتی تھیں۔ اِن کے علاوہ سرت ساگر میں بھی بہت سے قصے اور کہانیاں موجود ہیں۔ ان پچیس کہانیوں کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کی وجہ یہ محسوس ہوتی ہے کہ اِن کہانیوں کا آپس میں ایک خاص رشتہ بنتا ہے۔ اور وہ رشتہ ہے ''بیتال''، یعنی ایک ہی کردار اِن کہانیوں کو بیان کرتا ہے، اس لیے انھیں بیتال پچیسی کا نام دیا گیا ہے، یعنی بیتال کی پچیس کہانیاں۔ بقول مترجم محمد شاہ بادشاہ کے

زمانے میں صورت نام کیشور نے راجہ جے سنگھ سوائی، والی جے نگر کے کہنے پر اسے برج بھاشا میں منتقل کیا۔ پھر مارکوئیس ولزلی کے دور میں جان گل کرسٹ کی فرمائش پر بیتال پچیسی کو اُردو میں منتقل کر دیا گیا۔ اور یہ کام اُردو کے صاحبِ طرز ادیب مظہر علی ولا نے انجام دیا۔ بیتال پچیسی فورٹ ولیم کالج میں زیرِ تعلیم فوجی آفیسرز کے کورس میں بھی شامل تھی۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی رقم طراز ہیں:

> مورخہ ۱۲/ جنوری ۱۸۰۲ء کو گلکرسٹ نے کالج کونسل کو جن کتابوں کے زیرِ طبع ہونے کی اطلاع دی تھی، اُن میں بیتال پچیسی بھی شامل تھی۔ یہ کتاب اس وقت دیوناگری رسم الخط میں بڑے چوتھائی ۴۳۲ صفحات پر چھپ رہی تھی اور اس کے اخراجات کا تخمینہ ۸۵۰۰ روپے تھا۔ (۱۵)

کتھا سرت ساگر کی تالیف کا زمانہ تو معلوم نہیں البتہ راجہ بکرماجیت کا عہد ضرور معلوم ہے جس سے یہ کہانیاں تعلق رکھتی ہیں۔ راجہ بکرماجیت کا عہد ۳۷۵ء سے ۴۱۳ء تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ اس زمانے سے لے کر محمد شاہ کے عہد تک اور محمد شاہ کے عہد سے لے کر فورٹ ولیم کالج تک کا زمانہ خاصی طویل مدت پر محیط ہے۔ یہ کہانیاں اپنے اصل سے تقریباً پونے چودہ سو سال کا طویل سفر طے کر کے ہم تک پہنچتی ہیں۔ اس طویل مدت میں ان کہانیوں کا جزوی طور پر اپنے اصل سے تھوڑا بہت دور ہو جانا حیرانی کی بات نہیں۔ لیکن آج بھی جب ہم سنسکرت سے براہِ راست ترجمہ شدہ کہانیوں کا برج بھاشا کے راستے آنے والی کہانیوں سے موازنہ کرتے ہیں تو اِن میں جزوی طور پر تھوڑا بہت فرق ضرور ملتا ہے۔ لیکن یہ فرق اتنا زیادہ نہیں جتنی توقع کی جا سکتی تھی۔ جو تھوڑا بہت فرق موجود ہے نہ جانے وہ سنسکرت سے برج بھاشا میں منتقلی کے دوران پیدا ہوا یا پھر برج بھاشا سے اُردو میں ترجمہ کرتے وقت دَر آیا۔ اس بات کا ہم صحیح نتیجہ نہیں نکال سکتے کیونکہ آج ہمارے سامنے بھرج بھاشا کی مثالیں موجود نہیں۔

تکنیکی اعتبار سے یہ پچیس کہانیاں داستانوں کی نسبت افسانوں کے زیادہ قریب ہیں۔ ان کے کردار مافوق الفطرت نہیں بلکہ معاشرے کے عام جیتے جاگتے کردار ہیں۔ ان میں بیان کیے گئے واقعات بھی زندگی کے قریب محسوس ہوتے ہیں۔ اس میں بیتال کو بکرماجیت نے بھوت سمجھ کر نہیں اٹھا رکھا بلکہ شعوری انس اور تعلق کے تحت ایسا کر رکھا ہے۔ جس سے یہ احساس ملتا ہے کہ وہ دونوں ایک ہی شبھ لگن مہورت میں پیدا ہوئے تھے۔ بیتال نے راجہ بکرماجیت سے جن موضوعات

پر گفتگو کی، اُن موضوعات کا تعلق عام انسانوں کی روز مرّہ نفسیات سے ہے اور زندگی کے مختلف معاملات سے ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں:

> یہ اُن راجاؤں کی کہانیاں ہیں رشیوں کے بچار سنتے برہمنوں کی عزت کرتے، ان کے سراب سے ڈرتے اور روح کی جسم پر فتح کو مسلم سمجھتے ہیں...... یہ ان رشیوں کے قصے ہیں جو خیر اور شر کی تعلیم کے لیے اپنا ایک خاص نقطہ نظر رکھتے ہیں، جن کی جڑیں ہندو دیو مالا کے عقائد میں پیوست ہیں...... یہ کہانیاں پند و نصائح، اخلاقی اور حکیمانہ نکات سے لبریز ہیں اور اِن میں مشاہدے اور تجربے، علم و ہنر اور حکمت و دانش کے زیرِ سایہ پرورش پاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ (۱۶)

بیتال پچیسی کے متن کی تصحیح کرتے ہوئے ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے قاری کی سہولت کے لیے عمدہ تبدیلیاں کی ہیں اور متن مرتب کرتے وقت نہ صرف لغات سازی کی ہے بلکہ حواشی بھی لکھے ہیں، جس سے متن کی تفہیم آسان ہوگئی۔

بیتال پچیسی کے حواشی پر بات کرتے چلیں کہ بیتال پچیسی کی چھٹی کہانی میں جب دیوی ''لڑکی'' کو مرنے سے بچاتی ہے اور اس کے خاوند کے دوست (ولا کے نزدیک دوست اور Buitenen کے نزدیک لڑکی مدن سندری کے بھائی) کے دھڑوں سے سر لگا دینے کا کہتی ہے تو لڑکی مارے خوشی کے ''گھبراہٹ'' (ص ۷۱) میں سر بدل کر لگا دیتی ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی خوشی میں ''گھبراہٹ'' کو مبہم قرار دیتے ہیں اور اس گھبراہٹ کی وضاحت میں دو طرح کی انسانی جبلتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ''پہلی جبلت وہ ہے جس کے تحت انسان میں Ancest یا تزویج محرکات کا جذبہ جنم لیتا ہے۔'' (ص ۷۱) جس کے تحت مخالف جنس کے دو افراد آپس میں ایسے جنسی تعلقات استوار کرنا چاہتے ہیں جن کی معاشرت انھیں اجازت نہیں دیتی۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں اسی جذبے کے تحت لڑکی اپنے بھائی کے جسم پر اپنے خاوند کا سر لگا دیتی ہے۔ ''شاید وہ لاشعوری طور پر اس عمل سے بھائی کے جسم سے لذتِ لمس حاصل کرنا چاہتی ہے۔'' (ص ۷۱) دوسری جبلت Father-Seeking کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ''جس کے تحت لڑکی کا عشق اپنے خاوند سے اس قدر اَرفع (Sublime) ہو جاتا ہے کہ وہ اسے اپنے باپ یا بھائی کی صورت میں دیکھنا چاہتی ہے۔'' (ص ۷۲) ڈاکٹر صاحب یہ بات اپنی جگہ پر درست لیکن Buitenen کے برعکس اگر

مظہر علی ولا کی اس بات کو درست تصور کر لیا جائے کہ ایک تو وہ شخص مدن سندری کے خاوند کا دوست ہے اور دوسرا مدن سندری کو گھبراہٹ خوشی کے مارے ہوئی تو یہ نکتہ بھی وضاحت طلب تھا کہ کیا ''گھبراہٹ'' خوشی کے مارے ہو سکتی ہے یا نہیں؟ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ میرے خیال کے مطابق تو ایسا ممکن ہے کہ اچانک ملنے والی خوشی میں بے چینی، بے تابی، جلد بازی اور گھبراہٹ کا عنصر شامل ہوتا ہے، جس کی وجہ سے ایسی غلطی سرزد ہو سکتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے ''خوشی کے مارے گھبراہٹ'' کو مبہم (ص ۷۱) قرار دیا ہے، حالانکہ یہ بات اتنی مبہم نہیں جتنی ڈاکٹر صاحب نے تصور کر لی۔

۲۔ نتائج المعانی

نتائج المعانی ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے مجلس ترقی ادب کے لیے مرتب کی۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۷۴ء میں مطبع میڈیکل پریس، آگرہ سے شائع ہوا تھا ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اسی ایڈیشن کے متن پر کام کیا ہے۔ یہ کتاب ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اصل کتاب کی عبارت میں کافی الجھنیں تھیں، ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے ان اُلجھنوں کو دور کیا ہے۔ عبارت میں اعراب اور اوقاف کی پابندی نہیں کی گئی تھی۔ جملے دو دو سطروں تک مسلسل چلتے دکھائی دیتے تھے اور پیراگراف کا التزام عبارت میں موجود نہ تھا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے قاری کی سہولت کے لیے مناسب مقامات پر اعراب اور اوقاف کی نشاندہی کی اور باقاعدہ پیراگراف کی صورت میں عبارت کو تقسیم کیا تاکہ قاری پڑھتے وقت کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔

اس کے علاوہ بعض الفاظ کا استعمال جہاں قدیم انداز میں تھا وہاں ڈاکٹر صاحب نے مناسب تبدیلیاں کیں۔ لیکن اس بات کو بھی مدِّ نظر رکھا ہے کہ معنوی حوالے سے کوئی تبدیلی نہ ہو۔ مثال کے طور پر انھوں نے ایسی تبدیلیاں کیں۔ ''تماشا'' کو ''تماشے''، ''موہنہ'' کو ''منہ''، ''ووہی'' کو ''وہی''، ''یہہ'' کو ''یہ'' لکھا۔ اس طرح عبارت کی تفہیم میں کافی آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ اصل عبارت میں یائے معروف اور مجہول کے استعمال میں فرق نہیں کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں:

> ''گی'' کو ''گئے'' اور ''تھے'' کو ''تھی'' اکثر جگہ پر لکھا ہوا نظر آیا۔ میں نے اسے بھی درست کیا ہے۔ (۱۷)

اس کے علاوہ اصل عبارت میں کچھ لفظ چھوٹ گئے تھے یا کہیں کہیں زائد الفاظ آ گئے تھے جس سے نہ صرف عبارت کا تسلسل ٹوٹتا تھا بلکہ معانی کے خلط ملط ہونے کا اندیشہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جہاں الفاظ چھوٹ گئے تھے وہاں بریکٹ دے کر الفاظ کا اضافہ کر دیا اور جہاں زائد تھے وہاں حواشی دے کر لفظوں کو حذف کر دیا۔ عبارت میں بعض محاوروں کا اجنبی استعمال بھی دکھائی دیتا تھا۔ جہاں ڈاکٹر صاحب نے ضروری سمجھا وہاں محاوروں کو تبدیل کیا اور جہاں مصنف کے ذاتی اُسلوب کے مجروح ہونے کا خدشہ تھا وہاں ویسے ہی رہنے دیا ہے۔ اور اہم مقامات پر حواشی دیے ہیں اور قاری کی آسانی کے لیے یہ حواشی کتاب کے آخر میں دیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے نتائج المعانی کی تدوین میں اس بات کو مدِ نظر رکھا ہے کہ عبارت کی اصل روح مجروح بھی نہ ہو اور قاری کے لیے بھی آسانی ہو جائے۔ یہ تدوینِ متن کی اہم خصوصیات میں سے ایک ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں:

> اہم مقامات پر مختصر حواشی لکھے ہیں، متن کے ساتھ ساتھ حواشی کا چلنا تحقیقی ذوق رکھنے والوں کے لیے تو یقیناً دلچسپی اور آسانی کا باعث ہے لیکن عام قاری بعض اوقات اپنے اور کتاب کے موضوع کے درمیان ان چیزوں کو ایک رکاوٹ سمجھتا ہے۔ میں نے اسی بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حواشی کتاب کے آخر میں لگا دیے ہیں۔ (۱۸)

نتائج المعانی حکیم مومن خان مومن کے شاگرد آغا محمود بیگ راحت کی تصنیف ہے۔ محمود بیگ راحت ایک مستند شاعر اور صاحبِ طرز نثار تھے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ جہانگیر محمد خان دولہ والیِ بھوپال اکبر شاہ ثانی اور کرنل سکنر کی مصاحبت میں گزرا۔ نتائج المعانی راحت کی زندگی کے اہم واقعات پر مشتمل ہے، جنھیں انھوں نے دلچسپ حکایات کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس کتاب میں ان شخصیات کا ذکر بھی ملتا ہے جن سے کسی نہ کسی طرح راحت وابستہ رہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں:

> نتائج المعانی، جیسا کہ سببِ تالیف سے ظاہر ہے، ایک خاص مقصد کے لیے لکھی گئی۔ اور وہ یہ کہ اس میں بیان کیے گئے واقعات حاکمانِ والاشان کے پسند خاطر ہوں۔ اور مصنف کو از راہ قدردانی انعام و اکرام ملے۔ یہ کتاب منشی رونق علی

ایڈیٹر پٹیالہ اخبار کی فرمائش پر لکھی گئی..... نتائج المعانی اپنے دور میں مجلسی زندگی کا ایک عمدہ حوالہ سمجھی جاتی تھی کیونکہ اس میں بیان کیے گئے شجاعت، سخاوت اور عدالت کے قصے اس سرزمین اور ملک کے کرداروں کے بارے میں تھے جہاں اس کتاب کا قاری موجود تھا۔ راحت کو واقعہ بیان کرنے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ وہ جملوں کی دروبست اور اس سے دلچسپی پیدا کرنے کے فن سے آگاہ ہیں۔ ان کے انداز میں Directness ہے اور ان کے لفظوں میں وہی راست بازی اور صداقت ہے جو اُن کی اپنی شخصیت کا حصہ ہے۔ (۱۹)

اس کتاب میں اس دور کے حالات کی بھی تھوڑی بہت جھلک مل جاتی ہے۔ اس کتاب کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس کے ذریعے ہم ایک ایسے ادیب کے حالات اور اُسلوب نگارش سے متعارف ہوتے ہیں جس کا ذہنی رشتہ ایک طرف تو انیسویں صدی کے نصف اوّل کی سپاہانہ زندگی سے جڑا ہوا ہے اور دوسری طرف دلّی کی ٹکسالی اور لسانی روایات سے منسلک ہے۔ پروفیسر سلیم الرحمٰن زیرِ نظر کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حکایتوں کی دلچسپی سے قطع نظر اس کتاب کی افادیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ گویا ایک کھڑکی ہے، انیسویں صدی کے نصف اوّل کی طرف کھلتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کھڑکی بہت چھوٹی ہے اور اس کا محل بھی موزوں نہیں لیکن اس میں اس دور کے حالات کی تھوڑی بہت جھلک ضرور نظر آجاتی ہے۔ (۲۰)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کو مرزا محمود بیگ راحت کے حالات مرتب کرتے وقت کافی مشکل کا سامنا ہوا۔ خارجی ذرائع سے انھیں خاطر خواہ معلومات میسر نہ آسکیں اس کے لیے انھیں کتاب کے اندرونی مواد پر اِکتفا کرنا پڑا۔ انھوں نے مقدمہ لکھنے کے لیے اکثر معلومات کتاب کے مختلف مطالب سے حاصل کیں۔ اہم مقامات پر مختصر حواشی بھی لکھے ہیں۔ قاری کی سہولت کے لیے یہ حواشی کتاب کے آخر میں لگا دیے ہیں تاکہ پڑھتے وقت قاری کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔

۳۔ یادگارِ چشتی مصنفہ مولوی نور احمد چشتی

یادگارِ چشتی بھی مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور سے شائع ہوئی۔ سیّد امتیاز علی تاج نے اس کی ترتیب کا کام پہلے جناب حمید اے شیخ مرحوم کے حوالے کیا۔ اس کتاب کا ناقص مسودہ کافی عرصہ

تک شیخ صاحب کے پاس پڑا رہا۔ چند مسائل کی وجہ سے شیخ صاحب اس کام کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ پھر امتیاز علی تاج نے یہ کام ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے سپرد کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑے حوصلے اور اعتماد کے ساتھ اس ذمہ داری کو قبول کیا۔ (۲۱) متن کی تدوین اور حواشی کا کام تو انھوں نے بآسانی مکمل کر لیا، جب اِس پر ایک مبسوط مقدمہ لکھنے کی نوبت آئی تو مصنف اور اس کے خاندان کے سوانح سے متعلق خاطر خواہ مواد میسر نہ تھا، اور جو مواد میسر تھا وہ تحقیقی نقطۂ نظر سے قابلِ اعتماد نہ تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے انتہائی محنت اور جانفشانی سے از سرِ نو مواد کو دریافت کیا اور اس طرح یادگارِ چشتی کی ترتیب و تدوین کا کام کیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں:

> یادگارِ چشتی کو میں نے تلاش و جستجو کی سہ سالہ مسافرت میں پورا کیا۔ متن کی تدوین اور حواشی کا کام زیادہ مشکل نہ تھا، اصل کام مصنف اور اس کے خاندان کے سوانح پر تحقیق کا تھا۔ اس موضوع پر مطبوعہ صورت میں کوئی قابل اعتماد مواد موجود نہیں تھا۔ جو اِکا دُکا تحریریں تھیں، بعض کتابوں یا رسائل میں نظر آئیں، اشتباہ اور اغلاط سے پاک نہ تھیں چنانچہ ان سے قطع نظر کر کے از سرِ نو مآخذ کی تلاش شروع کر دی۔ (۲۲)

یادگارِ چشتی مولوی نور احمد چشتی کی تصنیف ہے۔ مولوی نور احمد چشتی ۱۸۲۹ء کو مولوی احمد بخش یکدل کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والدین کی مدد سے حاصل کی اور بعد میں انگریزی مدرسہ میں درس و تدریس کا آغاز کیا۔ جب ہندوستان میں انگریز افسروں نے اُردو فارسی سیکھنے کی ضرورت محسوس کی تو مولوی صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اُردو فارسی کی تدریس کے علاوہ مولوی صاحب نے انگریز افسروں کو ہندوستان کی تہذیب و ثقافت سے روشناس کرا دیا۔ جس کی وجہ سے مولوی صاحب کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور انھوں نے بہت سی کتابیں اپنے شاگردوں کی فرمائش پر تصنیف کیں۔ یادگارِ چشتی میں لاہور کی تہذیبی و ثقافتی زندگی پر خوب صورت انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولوی صاحب کی زندگی کا بیشتر حصہ لاہور میں گزرا۔ وہ لاہور کے رسم و رواج تہذیب و ثقافت کو خوب جانتے تھے۔ انھوں نے لاہور کی تہذیبی و ثقافتی زندگی کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور اسے مکمل جزئیات کے ساتھ یادگارِ چشتی میں سمو دیا۔ یادگارِ چشتی کی تدوین میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے جو مآخذ استعمال کیے ان کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور مکمل جانچ پرکھ کے

بعد اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ یادگارِ چشتی کے مقدمے اور بعض حصوں کا جاپانی زبان میں ''پنجاب کے رسم و رواج'' کے عنوان سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ ٹیٹسو یا ٹسو یوگوجی نے جاپان کے معروف اُردو سکالر ادیب اور ڈرامہ نگار پروفیسر اسادا یوتا کا کی زیرِ نگرانی کیا ہے۔

۴۔ **مثنوی ہشت عدل مع واسوخت از محمود بیگ راحت**

محمود بیگ راحت کی مثنوی ہشت عدل مع واسوخت، ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے تحقیق وحواشی کے ساتھ مرتّب کی۔ یہ مثنوی مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور نے فروری ۱۹۷۱ء میں شائع کی۔ صفحات کے لحاظ سے یہ کتاب ۱۴۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مرتّب نے اس پر ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے، جس پر فن پارے کی اہمیت پر بات کی گئی ہے اور حواشی میں مسائل و مشکلات کی نشاندہی اور وضاحت کی گئی ہے۔ مقدمے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے محمود بیگ راحت کے بارے میں اہم معلومات فراہم کی ہیں کہ محمود بیگ راحت نے دہلی کی طرف ہجرت کی۔ پٹیالہ میں راحت نے تنگ دستی اور عسرت میں زندگی بسر کی لیکن اپنی توجہ تصنیف و تالیف کی طرف مرکوز رکھی۔ پہلے تذکرہ خزینہ راحت، پھر مثنوی ہشت عدل اور اس کے بعد مثنوی نتائج المعانی لکھی۔ انھوں نے شاعری میں مومن خان مومن کی شاگردی اختیار کی تھی۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی محمود بیگ راحت کے بارے میں مقدمے میں رقم طراز ہیں:

> آغا محمود بیگ نام، راحت تخلص تھا۔ والد کا نام احمد بیگ اور آبائی وطن روم تھا۔ دہلی محلے فراش خانہ میں رہتے تھے۔ سپاہی پیشہ اور جواں مرد تھے۔ شعر و ادب کا شوق ابتدا سے تھا۔ اور شاعری میں حکیم مومن خان مومن دہلوی سے اصلاح لیتے تھے۔ (۲۳)

محمود بیگ راحت نے مثنوی ہشت عدل مہاراجہ مہندر سنگھ کی خدمت میں انعام کی غرض سے پیش کی لیکن اُن کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ ہشت عدل ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں پہلی مرتبہ مطبع نول کشور، پٹیالہ کے زیرِ اہتمام طبع ہوئی۔ یہی سال اس کی تصنیف کا سال ہے۔ مثنوی ہشت عدل میں عدل و انصاف کے موضوع پر آٹھ مختلف واقعات شامل ہیں۔ یہ آٹھوں واقعات مختلف بحروں میں نظم کیے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ آٹھوں واقعات آٹھ مختلف ادبی ٹکڑے بنتے ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ آٹھ واقعات ایک وحدت کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔

اِن کی وحدت عدل وانصاف ہے جسے ہم اِن آٹھوں واقعات کی مشترک خصوصیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ آٹھوں واقعات عدل وانصاف کی ایک خوب صورت لڑی میں پرو دیے گئے ہوں۔ مثنوی ہشت عدل میں ڈاکٹر صاحب نے جہاں لفظ چھوٹ گئے تھے بریکٹ میں دے کر وہاں اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ بہ طورِ مثال ص ۸۶ پر ''و'' کی کمی تھی اسے بریکٹ میں دے کر مذکورہ کمی کو پورا کر دیا گیا ہے۔ دیکھیے:

سر جھکائے ہوئے آگے جا کے
موقع (و) وقت مناسب پا کے (۲۴)

اس کے علاوہ جہاں جہاں لفظ مناسب نہیں لگ رہے تھے وہاں وہاں انھیں بدل کر نیچے فٹ نوٹ دے دیے گئے ہیں۔ ایسی تبدیلیاں عمل میں لاتے وقت یہ کوشش کی گئی ہے کہ شعر کے مفہوم میں کوئی ردو بدل نہ ہونے پائے۔ بہ طورِ مثال ص ۸۹ پر بڑی مناسب تبدیلی کی گئی ہے۔ اصل عبارت میں ''اس سے'' تھا، ڈاکٹر صاحب نے اسے ''اسے'' کر دیا، دیکھیے:

ایسی کیا اس سے ہوئی ہے تقصیر
جس کی دی تم نے (اسے) یہ تعزیر (۲۵)

واسوخت کا مکمل متن فدا علی عیش کے تذکرے شعلۂ جوالہ سے حاصل کیا گیا ہے۔ یہ واسوخت مسدس کی ہیئت میں نظم کیا گیا ہے اور ۶۰ بندوں پر مشتمل ہے۔ ہر دو اشعار کے بعد تیسرا شعر ٹیپ کا ہے جو پہلے دونوں شعروں میں بیان کیے گئے مضمون کو وحدت خیال عطا کرتا ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کتاب کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> راحت کے ہاں استعاروں کی کثرت نہیں، بالکل سیدھا سادا اور بلا واسطہ اظہار ہے۔ مضامین سلسلہ بہ سلسلہ آپس میں مربوط ہیں اور خطِ مستقیم میں برابر آگے بڑھ رہے ہیں...... راحت کے ہاں دلّی والا ہونے کا احساس اس کی تمام تحریروں میں موجود ہے، نتائج المعانی میں بھی، ہشت عدل میں بھی اور واسوخت میں بھی۔ دہلوی تہذیب کے خوشگوار اور زندگی سے لبریز نقوش راحت کے ہاں نظر آتے ہیں۔ (۲۶)

اس واسوخت کے بارے میں ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں:

> ایک بات اِس واسوخت سے اور ظاہر ہوتی ہے کہ عشق بازی میں دہلی اور لکھنؤ کی تہذیب میں کوئی فرق نہیں...... راحت کے واسوخت کا عاشق دو نمایاں تہذیبی و فکری سطحیں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، یہ دونوں دہلی میں بیک وقت موجود تھیں۔ (۴۷)

اس کتاب کا مبسوط مقدمہ ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی مزاج کا آئینہ دار ہے۔ اس مقدمے میں مصنف کے بارے میں خاطر خواہ معلومات کتاب کے متن سے فراہم کی گئی ہیں۔ اور اس طرح اس مقدمے میں حافظ محمود شیرانی کے اس قول کی پیروی کی گئی ہے کہ مصنف کا سب سے اہم سوانحی ماخذ اس کی تصنیف ہوتا ہے۔ مثنوی ہشت عدل کا مقدمہ تحقیق میں ایک نئے تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔

۵۔ مثنوی رمز العشق مع چرخی نامہ از غلام قادر شاہ

مثنوی رمز العشق غلام قادر شاہ بٹالوی کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اسے تحقیق و حواشی کے ساتھ مرتب کیا اور مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور نے بڑے اہتمام سے فروری ۱۹۷۲ء میں اسے زیورِ اشاعت سے آراستہ کیا ہے۔ اس کے صفحات کی کل تعداد ۶۴ ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اس پر ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے اور مثنوی کا متن بھی ساتھ ہی شامل کر دیا ہے۔ یہ متن ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے مثنوی کے پانچ قلمی نسخوں سے تیار کیا جو پنجاب یونیورسٹی کے ذخیرۂ شیرانی میں موجود ہیں۔ اس متن کی تدوین میں صرف ذخیرۂ شیرانی پر انحصار کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے مقدمے میں مصنف اور مصنف کے خاندان سے متعلق اہم معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اور زیر نظر مثنوی کے فنی پہلوؤں پر بھی محققانہ بحث کی ہے۔ یہ مثنوی کلاسیکی ادب کا شاہکار ہے اور اس کی تدوین بھی عمدہ ہے۔ مقدمے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں:

> بارہویں صدی ہجری کا زمانہ پنجاب میں اُردو زبان و ادب کی ترویج کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یوں تو اسی دور میں پنجاب کے سبھی حصوں میں اُردو زبان صوفیا کے ہاں ذریعۂ اظہار کے طور پر مقبول ہو چکی تھی، لیکن جس خطے نے اس سلسلے میں سب سے پہلے اہم خدمات انجام دیں وہ بٹالہ، ضلع گورداسپور کا علاقہ

ہے، جہاں پنجاب کے مشہور صوفی بزرگ حضرت سیّد ابوالفرح محمد فاضل الدین بٹالوی اوران کے ارادت مندوں نے تصنیف وتالیف کے ذریعے مذہبی تبلیغ کو جاری کیا۔ پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے اِس ادبی مرکز کو بٹالہ تحریک کا نام دیا ہے۔
مثنوی رمز العشق کے مصنف سیّد غلام قادر شاہ بٹالوی بھی اسی خاندان کے فرد تھے۔ وہ حضرت ابوالفرح محمد فاضل الدین کے فرزند اور بٹالہ تحریک کے روحِ رواں تھے۔ سیّد صاحب حضرت ابوالفرح کے اکلوتے فرزند، مرید اور جانشیں تھے۔ لقب اہل اللہ اور تخلص غلام قادر تھا۔ والد کی وفات کے بعد مسند آرائے خلافت ہوئے اور درگاہِ فاضلہ کو رشد وہدایت کا مرکز بنایا۔ دینی تعلیم کے لیے ایک مدرسے کی بنیاد رکھی جو تقسیمِ ملک یعنی ۱۹۴۷ء تک درس وتدریس کا مرکز رہا......
سیّد ابواحمد محمد شاہ حضرت غلام قادر کی تصنیف مثنوی رمز العشق کی شرح لکھی جو اپنے زمانے میں بے حد مقبول تھی۔ (۲۸)

سیّد غلام قادر نے مثنوی رمز العشق ۱۱۵۱ھ میں تصنیف کی۔ گویا یہ مثنوی سیّد غلام قادر کے والد بزرگوار کی زندگی ہی میں تصنیف ہو چکی تھی۔ اس مثنوی کا تعلق خطۂ پنجاب سے ہے۔ یہ ہندی اوزان میں نظم کی گئی ہے اوراس میں پنجابی زبان کی تمام تر خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اِس مثنوی میں عربی الفاظ واصطلاحات کا استعمال بھی بہ کثرت ملتا ہے۔ اس کی وجہ غلام قادر شاہ کی عربی اور فارسی پر غیر معمولی دسترس تھی۔ اس مثنوی میں ڈاکٹر صاحب نے چرخی نامہ کو بھی شامل کر دیا ہے۔ چرخی نامہ کا متن انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری کے ذخیرۂ شیرانی سے حاصل کیا۔ اس کے علاوہ یہ نظم ڈاکٹر صاحب کو کہیں اور سے مطبوعہ یا خطی صورت میں دستیاب نہیں ہوئی تھی اس لیے صرف ذخیرۂ شیرانی والی بیاض نمبر ۱۸۶۳ سے ہی استفادہ کیا گیا ہے۔

۶۔ پدماوت اُردو از میر ضیاء الدین عبرت وغلام علی عشرت

مثنوی پدماوت ملک جائسی کی تصنیف ہے۔ ملک جائسی نے یہ مثنوی شیر شاہ سوری کے دور میں ۱۵۴۰ء میں اودھی زبان میں تصنیف کی۔ پھر اس مثنوی کو رام پور کے شاعر ضیاء الدین عبرت نے اُردو زبان میں ڈھالنے کی کوشش کی لیکن زندگی نے وفا نہ کی، بہت جلد اُن کا انتقال ہو گیا۔ اور بعد میں یہی کام مرزا علی لطف کے شاگرد غلام علی عشرت نے انجام دیا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے

پدماوت کے فکری رشتے اور جڑیں دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا اس مثنوی کے حوالے سے تصحیح متن کا کام اس لیے بھی اہم ہے کہ انھیں اس مثنوی سے متعلق جو قدیم نسخے میسر ہوئے وہ مخطوطات کی املا میں تھے۔ مقدمے میں عشرت اور عبرت کے سوانح کلب علی خاں فائق نے تحریر کیے ہیں۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے مثنوی کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے مصنف کے معیار اور ضرورتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس کام کو انجام دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے **مثنوی پدماوت** کا مقدمہ بہت محنت اور جانکاہی سے حواشی کے ساتھ مرتّب کیا ہے۔ اس مقدمے میں مصنّفین کے اُسلوب کو کریدنے کی کوشش کی ہے اور مصنّفین کے کام کو مختلف زاویوں سے پرکھا ہے۔ اس لحاظ سے یہ مقدمہ اُن کے تنقیدی شعور کا آئینہ دار ہے۔ ڈاکٹر عطش درّانی لکھتے ہیں:

> ان کی مرتّب کردہ دیگر مثنویوں مثلاً **بیتال پچیسی**، **نتائج المعانی**، **رمزالعشق**، **پدماوت** میں میرے خیال میں **پدماوت** زیادہ اہم ہے۔ اگرچہ یہ ایک مطبوعہ کتاب ہے لیکن نایاب تھی اور اس کے فن کی صحت کے لحاظ سے یہ تدوین قابلِ توجہ ہے۔(۲۹)

مثنوی پدماوت ۵۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور نے شائع کیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید رقم طراز ہیں:

> ڈاکٹر گوہر نوشاہی دبستانِ لاہور کے تحقیقی مزاج کے ادیب ہیں۔ ان کے ادب کا سلسلہ نسب ڈاکٹر سیّد عبداللہ اور ڈاکٹر وحید قریشی سے ہوتا ہوا حافظ محمود شیرانی تک جا پہنچتا ہے۔ **پدماوتِ اُردو** میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے تحقیقِ متن اور صحتِ متن کے علاوہ مثنوی کی اندرونی شہادتوں سے عبرت اور عشرت کے اس استفادی کام کے بارے میں قابلِ قدر مواد فراہم کیا ہے اور نتائج اخذ کیے ہیں۔(۳۰)

ملک محمد جائسی کی یہ مثنوی اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوئی۔ ہر خاص و عام کی زبان پر اِس کی کہانی چڑھ گئی۔ شجاعت اور مردانگی کے واقعات کی وجہ سے راجپوتوں نے اسے سچا واقعہ سمجھ لیا حالانکہ اس کے واقعات کے سچے ہونے میں کافی شکوک وشبہات موجود ہیں۔ دراصل مثنوی کے اشعار مترنم اور رواں ہیں۔ یہ قصہ اگرچہ دو آدمیوں نے نظم کیا ہے۔ لیکن اس خوبی کے ساتھ کہ معلوم نہیں ہوتا کہ قصہ ایک آدمی نے لکھا ہے یا دو آدمیوں نے۔ وہ اس لیے کہ پہلے حصے کا زورِ قلم

اور لطف بیاں دوسرے حصے میں بھی قائم ہے۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے مثنوی کا مقدمہ حواشی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اور مثنوی کی اندرونی شہادتوں سے عبرت اور عشرت کے کام کے بارے میں خاطر خواہ معلومات فراہم کی ہیں اور عمدہ نتائج اخذ کیے ہیں۔ یہ کام اُن کے تحقیقی مزاج کا عکاس ہے۔

۷۔ قصہ خسروانِ عجم (شاہنامہ اُردو)

شاہنامہ فردوسی حماسہ نگاری میں بہت اہم مقام رکھتا ہے۔ رزمیہ شاعری میں حماسہ ایسے شاہکار نہ ملنے کے برابر ہیں۔ شاہنامہ فردوسی اگرچہ فارسی زبان میں لکھا گیا لیکن اُس نے پوری دنیا کے ادب کو متاثر کیا ہے۔ رزمیہ شاعری کے حوالے سے شاہنامہ کے اثرات پوری دنیا کے ادب پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ محمود غزنوی کے دربار میں جہاں ایران اور توران کے نامور شعرا اور ادبا کی بڑی تعداد موجود تھی وہاں برصغیر کے بلند پایہ شعرا اور ادبا بھی شامل تھے۔ سلطان محمود غزنوی اور اس کے جانشین نہ صرف برصغیر کی زبانوں کو جانتے تھے بلکہ سنسکرت اور دیگر مختلف زبانوں کی بھی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ غزنوی عہد کے اکابر شعرا کے کلام میں مقامی زبانوں کے بے شمار الفاظ ملتے ہیں، جو آج بھی اُردو زبان کا حصہ ہیں۔ خود فردوسی کے ہاں برصغیر کی تہذیب وثقافت کے اثرات واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ غزنوی عہد میں قصیدہ نگاری کے بعد شاہنامہ فردوسی کو بہت اہم مقام حاصل تھا۔ اس دور کے تمام اہلِ علم اور دانشور اصحاب شاہنامے کی عظمت کے سحر میں ڈوبے دکھائی دیتے ہیں۔ شاہنامہ فردوسی نے پنجاب میں بھی اپنے کافی اثرات چھوڑے ہیں۔ مغلیہ دور میں پہلی دفعہ شاہنامے کی ضخامت کم کرنے کے بارے میں سوچ بچار پیدا ہوا۔ اس ضرورت کو ہمایوں کے بیٹے اکبر شاہ کے دور میں محسوس کیا گیا۔ اسی بات کے پیشِ نظر تقی سوشتری نے پہلی بار شاہنامے کا فارسی میں خلاصہ تیار کیا۔ شاہنامے کا دوسرا خلاصہ اکبر کے پوتے شاہجہان کے دور میں توکل بیگ بن تولک بیگ حسنی نے چھبیس جلوس شاہجہانی ۱۰۶۳ھ کو تاریخ دلکشائے شمشیر خان کے نام سے کیا۔ اس خلاصے کو تاریخ شمشیر خانی بھی کہا جاتا ہے۔ جو بعد میں صرف شمشیر خانی کے نام سے معروف ہوا۔ جب یہ تاریخ شمشیر خانی ہندوستان پہنچی تو ہندوستان کے مورخین اور صاحبانِ علم وادب شاہنامہ فردوسی کی صحیح قدر و قیمت سے آشنا ہوئے۔ شمشیر خانی سے متعارف ہونے کے بعد برصغیر کے شعرا اصل شاہنامہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے شمشیر خانی

کے اُردو زبان میں ترجمے کیے۔ پہلا ترجمہ لال بھیم چند نے کیا۔ لال بھیم چند دیوگڑھ کے قلعہ دار برہان شاہ کے متوسل تھے۔ اس کتاب کا کوئی مخطوط اس وقت کسی کتاب خانے میں موجود نہیں۔ جس کی وجہ سے اب یہ اندازہ لگانا خاصا مشکل ہے کہ لال بھیم چند نے **تاریخ شمشیر خانی** ہی سے استفادہ کیا یا اس کے پیشِ نظر اصل شاہنامہ بھی تھا۔ بعد میں صرف **تاریخ شمشیر خانی** کے تین تراجم اُردو زبان میں ہوئے۔ پہلا ترجمہ مول چند منشی نے کیا جسے **شاہنامہ اُردو یا قصہ خسروانِ عجم** بھی کہتے ہیں۔ اس کا دوسرا ترجمہ امام بخش ناسخ کے شاگرد مرزا مہدی خان مقبول نے کیا۔ مہدی خان مقبول نے یہ ترجمہ ۱۸۵۱ء میں مکمل کیا۔ مہدی خان مقبول کے بعد اس کا تیسرا ترجمہ رجب علی بیگ سرور نے سرور سلطانی کے نام سے کیا جسے مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور نے شائع بھی کیا ہے۔ اِن تینوں تراجم میں سب سے قدیم ترجمہ مول چند منشی کا ہے، جسے ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اسلامی جمہوریہ ایران کے ثقافتی دفتر واقع اسلام آباد کے لیے مرتب کیا۔ اسے ایران کے کلچرل قونصلیٹ نے **شاہنامہ فردوسی** کے ایک ہزار سالہ جشن کے موقع پر شائع کیا۔ اور اس کے متعدد نسخے تہران یونیورسٹی میں منعقدہ بین الاقوامی فردوسی کانفرنس میں پیش کیے گئے۔ اس کانفرنس میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے بھی شرکت کی۔ ایران کے اہلِ علم اصحاب نے اس کام کو خوب سراہا، جس سے ڈاکٹر صاحب کو بہت پذیرائی ملی۔ زیرِ گفتگو متن **شاہنامہ اُردو** کے ایک ایسے نسخے پر مشتمل ہے جسے ایک ایرانی خطاط نے کمالِ فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے کتابت کیا تھا۔

۸۔ پنجابی شکوہ از پیرزادہ فضل احمد فاروقی

پنجابی شکوہ اقبال کی معروف نظم شکوہ کا منظوم پنجابی ترجمہ ہے۔ ''شکوہ'' کے آٹھ مختلف زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔ **پنجابی شکوہ** ۱۹۱۸ء میں اقبال کی زندگی ہی میں طبع ہوا۔ اس کے شاعر پیرزادہ فضل احمد فاروقی ۱۹۵۱ء کے قریب موضع ملیرن، ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ وہ پنجابی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ علاوہ ازیں اقبال اکثر جالندھر جایا کرتے تھے، جہاں ان کے اعزاز میں ادبی محفلیں سجائی جاتی تھیں اور انھیں وہاں بہت پذیرائی ملتی تھی۔ پیرزادہ فضل احمد فاروقی کو اقبال سے ملنے کے بہت مواقع نصیب ہوئے۔ وہ نہ صرف اقبال کی شخصیت اور ذاتی محاسن سے اچھی طرح واقف تھے بلکہ وہ اقبال کے فلسفۂ حیات اور فکری وحدت سے بھی متاثر تھے۔ جالندھر میں اقبال کی مقبولیت کا اندازہ **پنجابی شکوہ** سے لگایا جاسکتا ہے۔ پیرزادہ فضل احمد

فاروقی نے ''شکوہ'' کا منظوم ترجمہ کرتے ہوئے اقبال کے جذبات واحساسات کو مجروح نہیں ہونے دیا بلکہ اُن میں اور رنگ بھر دیے ہیں۔ اس میں اقبال کے جذبات واحساسات کی خوب ترجمانی کی گئی ہے۔ پیرزادہ صاحب نے پنجابی شکوہ میں پنجابی کے خاص اُسلوب اور لفاظی سے کام لیا ہے، جس سے کبھی اُن کے طبع زاد ہونے کا گمان بھی گزرتا ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں:

> پنجابی شکوہ کی ایک خصوصیت جو اُسے اس نظم کے دوسرے تراجم سے ممتاز کرتی ہے، یہ ہے کہ اس میں مترجم نے اصل تصنیف کے اُسلوب اور مزاج دونوں پر قدرت حاصل کرلی ہے۔ اُردو الفاظ کے بدلے میں پنجابی کے ایسے جچے تلے الفاظ استعمال کیے ہیں کہ اگر اصل تصنیف سامنے نہ ہو تو ترجمہ بجائے خود ایک تخلیق معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر اصل تصنیف سامنے ہو تو مترجم کی فنی مہارت پر اسے دل کھول کر داد دینی پڑتی ہے۔ (۳۱)

پنجابی شکوہ کے اصل نسخے میں کتابت اور بیشتر مقامات پر الفاظ کی غلطیاں تھیں۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اُن غلطیوں کو دور کیا اور انتہائی محنت اور لگن سے اسے مرتّب کیا جسے بعد میں پنجابی ادبی اکادمی، لاہور نے زیورِ طباعت سے آراستہ کیا۔ زیرِ نظر کتاب پنجابی شکوہ اقبالیات اور پنجابی ادب میں ایک خوب صورت اضافہ ہے۔

۹۔ دیوانِ غالب نسخۂ طاہر (تحقیق وحواشی)

محمد حسین آزاد کے پوتے آغا محمد طاہر کے پاس دیوانِ غالب کا ایک نسخہ تھا، جس کے اوپر غالب کی اصلاح موجود تھی اور غالب کی یادداشت بھی۔ آغا محمد طاہر نے یہ نسخہ بغیر کسی مقدمے اور حواشی کے شائع کر دیا۔ غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اسے مرتّب کیا اور مقدمہ اور حواشی لکھے۔ اس نسخے کا پورا متن پہلی مرتبہ ماہنامہ کتاب میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ماہنامہ کتاب سے کتابت شدہ مواد لے کر سنگ میل پبلشنگ ہاؤس، لاہور نے اسے کتابی صورت میں شائع کیا۔ اس کے مقدمے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے بعض غالب شناسوں کی اُن فروگزاشتوں کی نشاندہی کی ہے جو اُن سے نسخۂ طاہر پڑھتے ہوئے سرزد ہوئی تھیں۔ اس زمرے میں مالک رام جیسے اہم اور بلند پایہ غالب شناس بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی غالب پر تحقیقی دلچسپی اس مقدمے میں پوری اہمیت کے ساتھ واضح ہے۔

۱۰۔ مختصر قانونی اصطلاحات

مولوی فیروز دین ڈسکوی ایک اہم لغت نویس تھے جن کی اُردو، فارسی اور عربی لغات اہلِ علم اور اہلِ تحقیق سے داد پا چکی ہیں۔ اُن کی اُردو لغات کا نام **اُردو لغات فیروزی** ہے جو پہلی مرتبہ ۱۸۹۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس لغت میں قانونی اصطلاحات کا ایک جدول موجود ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے پوری لغات سے قانونی اصطلاحات کو جدا کر کے ایک کتاب کی صورت میں مرتب کیا۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب کا اہم علمی اور تحقیقی کام یہ ہے کہ اُن میں مولوی فیروز دین ڈسکوی کے بعض سوانح شرح و بست کے ساتھ پہلی مرتبہ منظرِ عام پر لائے گئے ہیں۔

۱۱۔ غالب کی خاندانی پنشن اور دیگر اُمور

یہ کتاب مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد اور نیشنل ڈاکومنٹیشن سنٹر کے اشتراک سے شائع ہوئی۔ اس کے صفحات کی کل تعداد ۴۵۱ ہے۔ اس کا پیش لفظ افتخار عارف نے تحریر کیا ہے اور مقدمہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے قلم بند کیا ہے۔

انیسویں صدی کے ربع اوّل میں مرزا اسد اللہ خان نے کلکتے میں اپنی خاندانی پنشن کا دعویٰ دائر کیا۔ کلکتے کے بعد دہلی میں مقدمہ دائر ہوا۔ اس تگ و دوہ میں غالب کی عمر کے سترہ برس صرف ہوگئے۔ آخر کار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اِن سترہ برس کے عرصہ میں غالب نے جو درخواستیں پیش کیں اور ان کے بارے میں جو جو رپورٹیں تیار ہوئیں ان سب کا ریکارڈ کلکتہ، دہلی اور لاہور آفس میں محفوظ تھا۔ اس سلسلے کی کچھ دستاویزات کی نقول انڈیا آفس لائبریری، لندن میں بھی موجود تھیں۔ نیشنل ڈاکومنٹیشن سنٹر کے نگران میاں سعد اللہ نے اپنے تحقیقی مزاج کے پیشِ نظر پنجاب آرکائیوز، دہلی آرکائیوز اور انڈیا آفس سے ۱۵۶ دستاویزات اکٹھی کیں جو غالب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں بطور خاص ان کی خاندانی پنشن کے مقدمے سے متعلق تھیں۔ یہ دستاویزات انگریزی اور فارسی زبان میں تھیں۔ انھیں ''غالب کی زندگی کے سترہ برس'' کے نام سے مرتب کیا گیا اور لاہور سے کمپوز بھی کرایا گیا لیکن چھپنے کی نوبت نہ آسکی۔ پھر یہ مجموعہ دوبارہ ڈاکومنٹیشن سنٹر کے نگران، جوائنٹ سیکرٹری پروفیسر نذیر احمد کے پاس آگیا۔ انھوں نے اشاعت کی غرض سے مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین افتخار عارف کے سپرد کر دیا۔ افتخار عارف نے طے شدہ منصوبے کے تحت ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے حوالے کر دیا اور ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اس پر ضروری حواشی دے کر

انگریزی متن کے اُردو ترجمے کے ساتھ از سرِ نو مرتب کیا اور اس پر ایک عالمانہ مقدمہ لکھ کر اسے واضح جہت عطا کر دی اور بعد میں ۱۹۹۷ء میں مرزا غالب کے دوصد سالہ جشن ولادت کے موقع پر اسے شائع کر دیا گیا۔ جناب افتخار عارف رقم طراز ہیں:

> غالب کی خاندانی پنشن اور دیگر اُمور میرے زمانے میں شائع ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا ہے کہ جس انہماک اور لگن کے ساتھ انھوں نے یہ کام کیا ہے میں سمجھتا ہوں اس موضوع پر کسی اور نے نہیں کیا۔ مواد کی جمع آوری کا جو سلیقہ ان کے ہاں اور ترتیب و پیش کش کے جن جدید قرینوں سے وہ واقف ہیں، اس کی داد نہ دینا بڑی ناانصافی ہوگی۔ غالب پر ان کے دوسرے تحقیقی مقالے بھی خاصے کی چیزیں ہیں۔ (۳۲)

غالب کی خاندانی پنشن اور دیگر امور پر راشد حمید نوائے وقت میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے نہ صرف اپنی نگرانی میں انگریزی متن کا ترجمہ کرایا اور اس پر نظر ثانی کی، ان دستاویزات میں مذکورہ تمام اشخاص پر سوانحی حواشی لکھے بلکہ کتاب پر ایک مبسوط اور عالمانہ مقدمہ بھی تحریر کیا۔ گویا میاں سعد اللہ نے جس کام کا ایک ڈھانچہ تیار کیا تھا، ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اس عمارت کو مکمل کیا۔ یہ ایک علمی کام ہے جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ (۳۳)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اس پر ضروری حواشی دیے۔ انگریزی متن کے اُردو میں ترجمے کیے اور اس پر ایک عمدہ مقدمہ بھی لکھا۔ ڈاکٹر صاحب نے غالب کی پنشن سے متعلق مقدمے سے متعلقہ اسناد اور دستاویزات کو بہت احتیاط سے مرتب کیا ہے۔ اُن دستاویزات کے بعد اس مقدمے سے متعلق پینسٹھ لوگوں کے حالات بہت محنت اور دیدہ ریزی سے درج کیے ہیں۔ اس پر جو حواشی دیے گئے ہیں وہ ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی مزاج کے آئینہ دار ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

> اُردو کے ممتاز محقق ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی نگرانی میں اِن دستاویز پر ضروری حواشی لکھے گئے، انھیں مرتب کیا گیا اور پھر ان کا اُردو میں ترجمہ کیا گیا...... کتاب کے

شروع میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا لکھا ہوا مختصر لیکن بہت جامع مقدمہ ہے، پھر دو سو اکیاون صفحات پر مقدمے سے متعلق اسناد اور دستاویزات بہت احتیاط سے نقل کی گئی ہیں...... یہ دستاویزات جتنے سلیقے اور سائنٹفک انداز میں مرتب کی گئی ہیں وہ یقیناً غالبیات میں اہم اضافہ ہے۔ (۳۴)

ڈاکٹر صاحب نے ان تحریروں کا اس انداز سے اُردو ترجمہ کروایا ہے کہ ان کے اُردو میں لکھے جانے کا گماں گزرتا ہے۔ اس کام کو نہ صرف پاکستان میں بلکہ ہندوستان میں بھی پذیرائی ملی۔ تمام علمی و ادبی حلقوں میں اِس کام کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

۱۲۔ جائزہ زبانِ اُردو (پنجاب)

بیسویں صدی کے آغاز میں اُردو زبان، سر سیّد کے بعد ایک بار پھر بحث و تمحیص کا موضوع بنی۔ سر سیّد کے دور میں بنارس کے سرودا پرشاد اور سر سیّد کے درمیان خط کتابت کا سلسلہ چلا تھا جس کا محرک بھی اُردو مخالف نظریہ ہی تھا۔ اُردو زبان مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کی عکاس ہے اس لیے اس زبان کی بالادستی ہندوؤں کے لیے قابلِ قبول نہ تھی۔ اہلِ ہنود کا مؤقف تھا کہ اُردو کے بجائے ہندی کو برصغیر کی عام زبان تسلیم کیا جائے۔ ایسی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ''انجمنِ ترقیِ اُردو کے صدر ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے ۱۹۳۵ء میں برصغیر کے مختلف علاقوں میں ''جائزہ زبانِ اُردو'' کے نام سے مختلف کمیٹیاں قائم کیں، تاکہ ہر علاقے میں زبانِ اُردو کے ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے ٹھوس حقائق کی نشاندہی کی جاسکے۔'' (۳۵)

ہر کمیٹی کے کنوینر مقرر کیے گئے۔ پنجاب میں یہ ذمہ داری خواجہ عبدالوحید کو سونپی گئی۔ خواجہ صاحب نے انجمن ترقیِ اُردو (پنجاب) کے سیکرٹری کی حیثیت سے اور متعدد اہلِ علم و دانش کی مدد سے رپورٹ تیار کروائی۔ خواجہ صاحب نے رپورٹ تیار کروانے کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ جب اہلِ علم کی طرف سے مسودات خواجہ صاحب کے پاس پہنچتے وہ انھیں ایک منشی (جو اس کام کے لیے مقرر تھا) کی مدد سے نقل کرواتے۔ نقل شدہ مسودات مولوی عبدالحق کو بھجوا دیتے اور ان کی اصل کاپی دفتر کے ریکارڈ میں رکھ دیتے۔ مولوی عبدالحق کو بھیجی گئی نقول تو دست بردِ زمانہ کا شکار ہو گئیں البتہ دفتری ریکارڈ محفوظ رہا۔ خواجہ عبدالوحید کی وفات کے بعد مسودات کا فائل ان کے فرزند مشفق خواجہ کی تحویل میں آگیا۔ انھوں نے ڈاکٹر عبدالوحید قریشی (جو اس وقت مقتدرہ قومی زبان کے

صدر نشین تھے) کے سپرد کر دیا تاکہ "مناسب تدوین وتعارف کے بعد اسے مقتدرہ کی طرف سے شائع کر دیا جائے۔" (۳۶) اس کے بعد کافی عرصہ یہ کام تعطل کا شکار رہا۔ بعدازاں یہ کام ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے خود انجام دینے کی بجائے ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے سپرد کر دیا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی اسے جائزہ زبانِ اُردو راجپوتانہ کے مطابق ترتیب دینا چاہتے تھے لیکن مسودات کو دیکھنے کے بعد انھیں اندازہ ہوا کہ "بعض استفسارات ان مسودوں میں جائزہ زبان اُردو راجپوتانہ کے مطابق نہیں ہیں۔" (۳۷) چنانچہ انھوں نے ان تحریروں اور مطالب کو مولوی عبدالحق کے وضع کردہ استفسارات کے مطابق ہی ترتیب دے دیا اور انھیں الگ الگ ابواب میں تقسیم کر کے کتابی صورت دے دی۔ خواجہ عبدالوحید صاحب کی تیار کردہ مسل میں موجودہ صورت نہیں تھی۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اس کی ابواب بندی کی، حواشی لکھے اور مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ احتراماً کتاب کے باہر مرتّب کی جگہ خواجہ عبدالوحید صاحب کا نام دے دیا اور اندرونی صفحہ کے دوسرے نمبر پر اپنا نام لکھوایا۔ ویسے بھی خواجہ عبدالوحید کی وفات ۱۹۷۹ء میں ہوئی تھی اور جائزہ زبانِ اُردو (پنجاب) ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی تھی، اس طرح اس کی تدوین و اشاعت کی ذمہ داری ڈاکٹر گوہر نوشاہی کو ہی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی راقم الحروف کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> جائزہ زبانِ اُردو (پنجاب) میری ہی تدوین ہے۔ اس کے بیرونی صفحہ پر میں نے احتراماً خواجہ عبدالوحید صاحب کا نام دے دیا۔ اندرونی صفحہ پر بھی میں تو اپنا نام نہیں دینا چاہتا تھا، مشفق خواجہ صاحب کے اصرار پر میں اندرونی صفحہ پر اپنا نام دینے پر رضامند ہو گیا۔ (۳۸)

اس کتاب کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں استفسارات جائزہ زبانِ اُردو (پنجاب) کے جوابات شامل کیے گئے ہیں جو مردم شماری کے ذریعے ڈاکٹر عبداللہ چغتائی (رکن ترقی اُردو پنجاب) نے دیے تھے۔ دوسرے باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کے پہلے حصے میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کی تیار کردہ رپورٹ شامل کی گئی ہے جس میں ان سرکاری و غیر سرکاری مدارس کا ذکر کیا گیا ہے جن میں اُردو تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے دوسرے حصے میں قاضی فتح محمد فاتح کا تیار کیا گیا جائزہ بہ عنوان "جائزہ زبانِ اُردو ضلع میانوالی" شامل کیا گیا ہے۔

تیسرے باب کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں ان انجمنوں کا ذکر ہے جن کے اغراض و مقاصد میں اُردو کی تعلیم و توسیع ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ اور دوسرے حصے میں ان انجمنوں کا ذکر شامل ہے جو محض اُردو ادب کی توسیع و اشاعت کے لیے قائم کی گئی تھیں۔

چوتھے باب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے نمبر پر اُس وقت پنجاب میں موجود جرائد و مطابع کی فہرست دی گئی ہے جو ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور بدرالدین بدر نے تیار کی تھی۔ دوسرے نمبر پر ۱۹۳۵ء کی ابتدا سے موجود رسائل، جرائد و مطابع کی فہرست دی گئی ہے۔ تیسرے نمبر پر ہفتہ وار اخبارات اور چوتھے نمبر پر اُردو صحافت لاہور کا ذکر ہے۔

پانچویں باب میں شمس العلما میر ممتاز علی کا مضمون ''اُردو کی ترقی کا مسئلہ'' شامل کیا گیا ہے، جس میں انھوں نے اُردو زبان کی ترقی کے لیے چند مشوروں کے ساتھ اُن مسائل کو زیرِ بحث لایا ہے جو اُردو زبان کے راستے کی رکاوٹ تھے۔ چھٹے باب میں حافظ محمود شیرانی کا مسودہ ''پنجاب میں قدیم اُردو ادب'' شامل ہے۔ اس سلسلے میں مقالات حافظ محمود شیرانی مرتبہ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کی صورت میں زیرِ نظر کتاب سے کئی گنا عمدہ مواد اب سامنے آ چکا ہے، البتہ زیرِ نظر مواد کو نقشِ اوّل کی حیثیت حاصل ہے۔ ساتویں باب میں سردار عبدالحمید کا طویل مضمون بہ عنوان ''اُردو کے پنجابی مصنفین اور ان کی تصانیف ۱۸۴۹ء تا ۱۸۹۵ء'' شامل ہے، جسے تین حصوں؛ حصہ اوّل، حصہ دوم، حصہ سوم میں شامل کیا گیا ہے۔ اس میں سردار عبدالحمید نے مولوی نور احمد چشتی اور ان کے خاندان کی تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ آٹھویں باب میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی تحریر بہ عنوان ''پنجاب میں بیسویں صدی کے بعض خدمت گزارانِ اُردو'' شامل کی گئی ہے، جس میں سیّد صاحب نے اُردو زبان کی خدمت گزار اہم شخصیات اور اداروں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اس کتاب کے آخر میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے چند اہم حواشی دیے ہیں جن سے اس کتاب کی تفہیم میں بہت آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔

۱۴۔ نقشِ خیال از استاد غلام محی الدین مونس نقشی

نقشِ خیال ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا پنجابی ادب کے حوالے سے اہم تدوینی کام ہے۔ یہ کتاب ادارہ اُسلوب، اسلام آباد سے جنوری ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی۔ استاد غلام محی الدین مونس نقشی پنجابی زبان کے منفرد اور صاحبِ طرز شعرا میں سے تھے۔ انھیں شاعری فطرت سے ودیعت

کی گئی تھی۔ انھوں نے اپنے عہد کے عظیم پنجابی شعرا سے استفادہ کیا۔ تحریکِ پاکستان کے اہم عالمِ دین مولانا غلام محمد ترنم سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد ان کے کلام کے بیشتر مجموعے دست بردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکے۔ چار بیاضیں تمام اور نا تمام صورت میں ان کے گھر پر موجود تھیں لیکن بے اعتنائی کا شکار۔ اُن کے صاحبزادے ڈاکٹر رشید امجد نے طاقِ نسیاں پر پڑے ہوئے اس کلام کو دیکھا اور اسے شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ ڈاکٹر رشید امجد نے اس کی تدوین اور تعارف کے لیے اپنے دیرینہ دوست ڈاکٹر گوہر نوشاہی سے فرمائش کی۔ نقشِ خیال اسی فرمائش کی تکمیل ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اس غیر مرتب، غیر مدوّن اور بے ترتیب کام کو شکل وصورت دی اور ایک نمائندہ کتاب کی صورت میں مدوّن کیا۔ متن کے آغاز میں ایک مفصّل مقدمہ بھی ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے قلم سے لکھا گیا ہے۔ جس میں مونس نقشی کے زمانے، اساتذہ شعری مقام، اولاد اور شاگردوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس مقدمے میں مونس نقشی کی شاعرانہ عظمت اور پنجابی شاعری میں ان کے مقام کا تعین بھی کیا گیا ہے۔ استاد مونس کے اُسلوب اور زبان کے بارے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں:

> استاد مونس نقشی کی پنجابی زبان مغربی پنجاب کی لسانی روایت کا ایک خوب صورت نمونہ ہے، جس میں لسانی دروبست اپنے فطری اور تاریخی آہنگ کے ساتھ موجود ہے۔ ان کے کلام کے بنیادی خدوخال پر توجہ دینے سے واضح ہوتا ہے کہ ایک طرف ان کے فکری اور تخلیقی شعور میں اگر تصوف، اسلامی اقدار اور اسلامی افکار و نظریات کو اہمیت حاصل ہے تو دوسری طرف ان کے نظامِ فن میں وہ جمالیاتی اقدار نمایاں ہیں جن کا تعلق پنجاب کی معاشرت اور طرز بود و باش سے ہے۔ (۳۹)

نقشِ خیال کی تدوین میں ایک نقطہ بے حد اہم ہے کہ استاد مونس نقشی کی بیاضوں میں ان کے استاد مولانا غلام محمد ترنم کا کلام بھی شامل تھا۔ یہ قدیم شعرا کی روایت رہی ہے کہ وہ اپنے کلام میں تبرک اور یمن و برکت کے لیے اپنے استاد کا کلام شامل کرتے تھے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اس کلام کی نشاندہی کی اور اسے الگ حصہ بنا کر شائع کیا۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا یہ کام ان کے بقول نقشِ اوّل ہے۔ اس کتاب پر نظرِ ثانی اور

اضافوں کا سلسلہ جاری ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے نقشِ خیال میں استاد مونس نقشی کے اُردو کلام کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی ایک اُردو غزل بھی شائع کی ہے۔ اسے بجائے خود ایک دریافت کہنا چاہیے، تحقیق میں دریافت کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ مونس نقشی کے اُردو کلام کی تلاش جاری رہنی چاہیے۔

نقشِ خیال کے بیک ٹائٹل پر ڈاکٹر رشید امجد کی تحریر ہے۔ اس مختصر تحریر میں وہ لکھتے ہیں:

> یہ کلام قیامِ پاکستان کے بعد کا ہے، بعض پر تاریخ درج تھی لیکن زیادہ تر کلام بغیر تاریخ کے ہے۔ (۴۰)

اس کتاب کا نیا ایڈیشن لاہور سے مقصود پبلشرز نے ۲۰۰۹ء میں شائع کیا ہے، جس میں اضافے اور بعض اہم تبدیلیاں کی گئی ہیں۔

تحقیق میں تدوینِ متن بہت مشکل اور اعصاب شکن کام ہوتا ہے۔ اس میں بہت پیچیدہ مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ اس کے لیے یکسوئی، ارتکازِ فکر اور منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک مدوّن اور محقق کے لیے کثیر المطالعہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں مخطوطہ شناسی، خط فہمی اور لفظ بینی ایسی خصوصیات کا ہونا بھی لازم ہوتا ہے۔ اور یہ تمام خصوصیات ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے مزاج میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

پانچواں باب

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی فارسی خدمات

تین سال کی عمر سے والد صاحب کے ذریعے فارسی کی تدریس، اُردو کے ساتھ ساتھ شروع ہوئی۔ ہائی سکول داخلے تک یعنی چھٹی جماعت تک انھوں نے بعض اہم فارسی شعرا کے اشعار یاد کر رکھے تھے۔ بچپن ہی سے فارسی اُن کا پسندیدہ مضمون رہا ہے۔ وہ اپنے ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں:

> فارسی میرا سب سے پسندیدہ اور دل خواہ مضمون ہے۔ اس کی تعلیم میری تین سال کی عمر سے شروع ہوئی۔ فارسی زبان کی شائستگی، لطافت، اس کی غنائی کیفیت مجھے متاثر کرتی ہے۔ میں نے زندگی کے ہر دور میں فارسی کے مطالعے اور فارسی میں تحقیق کو جاری رکھا۔ (۱)

پانچویں سے دسویں کلاس تک انھوں نے فارسی کے کلاسیکی متون میں سے بعض اہم متون اپنے والد صاحب سے پڑھ لیے تھے جن میں پنج گنج، گلستان، بوستان، مثنوی مولانا روم کے کچھ حصے، شاہنامہ فردوسی کے کچھ حصے، مثنوی غنیمت، ملا جامی کی بہارستان وغیرہ بھی شامل ہیں۔ بی۔ اے سے ایم۔اے تک انھوں نے فارسی کے ایرانی لہجے کی طرف توجہ دی۔ خانہ فرہنگ ایران، لاہور سے فارسی کا جدید لہجہ سیکھا۔ یہاں کے اساتذہ میں سے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو گوہر صاحب بہت احترام سے یاد کرتے ہیں۔ ایم۔اے اُردو میں داخلے کے وقت ان کے ساتھ ڈاکٹر وحید قریشی اس بات پر خفا تھے کہ گوہر صاحب نے اُردو کو فارسی پر ترجیح دیتے ہوئے ایم۔اے اُردو میں داخلہ کیوں لیا۔ دراصل ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے ایم۔اے اُردو میں داخلہ اس لیے لیا تھا کہ ایم۔اے اُردو کرنے سے وہ جسم و روح کا رشتہ بہتر طور پر قائم رکھ سکتے تھے، اس کے برعکس فارسی زبان و ادب

میں ایم.اے کرنے سے انھیں روزگار کے حصول کے لیے مشکلات کا خدشہ تھا۔ڈاکٹر گوہر نوشاہی تہمینہ نذیر کو انٹرویو دیتے ہوئے اس بات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

ایم.اے میں داخلہ لیا تو پہلے فارسی کو منتخب کرنا چاہا مگر جب میرے ذہن میں یہ سوال اُبھرا کہ جب تک ملازمت نہ کی جائے گی اس وقت تک روزی نہیں کمائی جاسکتی۔اس وجہ سے میں نے اُردو کا مضمون منتخب کیا۔ (۲)

ڈاکٹر وحید قریشی ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے ایم.اے فارسی کرنے کے حق میں تھے۔انھوں نے کسی سے کہا تھا کہ گوہر نوشاہی اگر ایم.اے فارسی کرتے تو یقیناً ان کا گولڈ میڈل ہوتا،افسوس کہ انھوں نے اپنا گولڈ میڈل گنوا دیا۔گوہر صاحب نے ایف.اے میں فارسی مولانا علم الدین سالک اور بی.اے میں فارسی ڈاکٹر وحید قریشی سے پڑھی تھی۔

خدمات

بی.اے تک انھوں نے فارسی موضوعات پر اُردو فارسی شعرا پر تحقیقی کام شروع کر رکھا تھا۔ ایف.اے میں اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ کے جریدے کریسنٹ میں محمد افضل سرخوش مصنف تذکرہ کلمات الشعرا پر اُن کا مقالہ شائع ہوا تو اساتذہ نے اسے غیر معمولی داد و تحسین کے قابل سمجھا۔بی.اے کے زمانے میں اُن کا فارسی ادب پر ایک اہم کارنامہ غنیمت کنجاہی مصنف نیرنگِ عشق پر تحقیقی مقالہ تھا۔اس مقالے کا اعزاز یہ ہے کہ اسے ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے اورینٹل کالج میگزین میں شائع کیا۔اسی زمانے میں انھوں نے مرزا صاحباں پر لکھی گئی فارسی مثنوی تفنگِ عشق پر مقالہ لکھا جو ہفت روزہ لیل و نہار میں شائع ہوا۔بی.اے میں اسلامیہ کالج، سول لائن کے رسالے فاران میں بھی نیرنگِ عشق کے بارے میں ان کے تحقیقی مقالے شائع ہوئے جن میں سے ایک ''نیرنگِ عشق کی شہرت و مقبولیت'' اور دوسرا ''نیرنگِ عشق کے نادر قلمی اور مطبوعہ نسخے'' تھا۔۱۹۷۲ء میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی ایران چلے گئے۔ان کی تقرری مشہد یونیورسٹی ایران میں ہوئی تو انھوں نے اُردو سے قلم روک کر فارسی میں لکھنا شروع کیا۔مشہد یونیورسٹی کے جریدے مجلہ دانش کدہ ادبیات و علوم انسانی میں ان کے دو مقالات ''حافظ اور اقبال'' اور ''احوال و آثار فخر الشعرا بیکدل چشتی'' شائع ہوئے جنھیں مشہد یونیورسٹی کے ایرانی اساتذہ اور ایران کے بعض اہم محققین نے پسند کیا۔

گوہر صاحب کو قیامِ مشہد کے آخری دنوں میں دانش گاہِ مشہد کی طرف سے پی ایچ.ڈی کا موضوع بھی مل گیا تھا۔ اُن کا موضوع ''مسعود لنبانی'' کے کلیات کی تدوین تھا اور ان کے نگران ڈاکٹر غلام حسین یوسفی تھے۔ (۳) لیکن ایران کے سیاسی اور اسلامی انقلاب میں یونیورسٹیوں کا نظام تھوڑے عرصہ کے لیے درہم برہم ہو گیا تو گوہر صاحب واپس پاکستان آگئے اور یہ کام پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ مشہد میں قیام کے دوران ان کے فارسی مضامین مختلف روزناموں میں بھی شائع ہوئے۔ چنانچہ اقبال کے بعض موضوعات پر ان کے مضامین روزنامہ آفتابِ شرق اور خراسان میں شائع کیے گئے۔ ایران کے ایک سکالر محمد حسین ساکت مؤلف آئینہ کمال نے فارسی سکالرز کے تحقیقی مقالات کا ایک مجموعہ شائع کیا جس میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی صاحب کا بھی ایک مضمون شامل ہے۔ مشہد یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم فارسی تھا اور گوہر صاحب فارسی میں ہی اقبال اور اُردو زبان کے مطالب پڑھاتے تھے۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی اُردو کی طرح فارسی پر دسترس رکھتے ہیں اور فارسی بھی اُردو کی طرح روانی سے بول سکتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر گوہر نوشاہی...... اُردو فارسی دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے ہیں اور فارسی ایسی روانی سے ایرانی لہجے میں بولتے ہیں کہ لطف آجاتا ہے۔ برسوں مشہد یونیورسٹی میں ایرانی طلبا و طالبات کو فارسی کے ذریعے اُردو کی تعلیم دیتے رہے ہیں۔ (۴)

ان کی فارسی دانی کا اعتراف کرتے ہوئے افتخار عارف کہتے ہیں:

> گوہر نوشاہی اُردو اور فارسی کے موجود سکالروں میں بہت لائق، مستند اور معتبر حیثیت رکھتے ہیں۔ اُردو اور فارسی کی کلاسیکی ادبی روایت پر گہری نظر رکھتے ہیں اور زبان کے ارتقائی مراحل و منازل سے پوری آگاہی رکھتے ہیں۔ بیک وقت زبان اور ادب پر دسترس رکھنے والوں کی کسی بھی محدود فہرست میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا نام بہت نمایاں نظر آئے گا۔ (۵)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی ۱۹۸۵ء میں ایران سے واپس اسلام آباد آگئے۔ ایران سے واپسی کے بعد بھی فارسی خدمات کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔ مقتدرہ قومی زبان میں مصروفیت کے دوران میں

انھوں نے فارسی کے بعض اہم کام انجام دیے۔ ان قابلِ ذکر کاموں میں مول چند منشی کے شاہنامہ فردوسی کے اُردو ترجمہ کی تدوین ہے۔ شاہنامہ فردوسی کے بارے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں:

اُردو ادب میں شاہنامہ فردوسی تراجم، مطالب اور اُسلوب تینوں صورتوں میں داخل ہوا۔ (۶)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی مول چند منشی کا تعارف اِن الفاظ میں کرواتے ہیں:

مصنف مول چند منشی کائستھ، دہلی کے رہنے والے تھے۔ شاہ نصیر دہلوی (۱۷۶۱-۱۸۳۸ء) کے شاگرد اور شاہ عالم آفتاب کے متوسلین میں سے تھے۔ تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ بادشاہ کی شان میں قصیدے کہتے تھے اور بادشاہ ہی کے عہد میں شاہنامہ فردوسی کے مطالب اُردو میں نظم کیے۔ قلعہ شاہی میں آمد ورفت بے تکلف تھی۔ ۱۸۲۲ء میں انتقال کیا۔ (۷)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اس کام کو شاہنامہ فردوسی کے ہزار سالہ جشن کی مناسبت سے انجام دیا اور اسے ایرانی کلچرل قونصلیٹ، اسلام آباد نے شائع کر کے جشن فردوسی پر ایران روانہ کیا۔ دوسرا اہم کام فرہنگ مشترک کی تدوین ہے، جس میں ای. سی. او. ممالک میں بولی جانے والی زبانوں میں مشترک الفاظ کی تدوین ہے۔ یہ الفاظ بنیادی طور پر فارسی کے ہیں جو اُردو، فارسی، دری، ازبکی، تاجک، ترکی وغیرہ میں مشترک اور ہم معنی طور پر بولے جاتے ہیں۔ یہ کام چونکہ بنیادی طور پر فارسی زبان سے تعلق رکھتا تھا، اس لیے ایران میں اس کی پذیرائی ہوئی۔ ایران کی کلچرل کونسل نے اس کتاب کی تقریب رونمائی کا بڑی شان وشوکت سے اہتمام کیا۔ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد کے مجلّے اخبار اُردو کی نومبر ۱۹۹۷ء کی اشاعت میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ اس تقریب میں ملک کے نامور اہلِ علم اور پاکستان کے سابق سفیروں نے مقالات پڑھے۔ ان میں ایران کے کلچرل سرپرست "آقائے علی ذوعلم" اور ایران کے مشہور شاعر اور سکالر ڈاکٹر محمد حسین تسبیحی، پروفیسر فتح محمد ملک، افتخار عارف، ڈاکٹر عارف نوشاہی اور پاکستان کے سابق سفیر محمد ابوالفضل کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

فرہنگ مشترک کا پیش لفظ پاکستان کے بلند پایہ محقق ڈاکٹر دانی نے تحریر کیا تھا۔ ایران اور پاکستان کے کئی اداروں، مجلّوں اور اخبارات نے اس کتاب پر خبریں اور تبصرے شائع کیے۔

پروفیسر نظیر صدیقی فرہنگ مشترک پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

Dr. Gauhar Naushaih's book is one of the early fruit of the ECO. Undoubtedly, it was laborious work but as a true research scholar he was not daunted by the labour it entailed. Such work was not inspired by Regional Co-operation Development (generally known as RCD) which comprised Turkey, Iran and Pakistan. In his erudite Preface, Dr. Naushahi has traced back the historical and cultural relationship between Pakistan and Central Asia to thousands of years. He claims that the discovery of Mohenjodaro relics in the archaeological remains of Modern Trukamenistan is a proof of the fact that relations between the Lands of Pakistan and Trukamenistan developed as far back as the first century B.C.(۸)

فرہنگ مشترک ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا اہم کام ہے جسے ملک اور ملک سے باہر کافی پذیرائی ملی۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی ایک اور اہم تصنیف ایران نامہ ہے۔ ایران نامہ بزمِ اقبال، کلب روڈ، لاہور سے ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں زیادہ تر فارسی زبان و ادب پر لکھے گئے مقالات شامل ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں ایران میں ایرانی بادشاہت کا اڑھائی ہزار سالہ جشن منایا گیا، جس کی مناسبت سے تمام ایران دوست ملکوں میں ایرانی ثقافت اور ادب پر تصانیف شائع کی

گئیں۔ پاکستان نے بھی اس علمی تحریک میں حصہ لیا۔ بزمِ اقبال کی طرف سے ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے فارسی زبان و ادب کے بارے میں ان مقالات کا مجموعہ مرتّب کیا جو مجلّہ اقبال میں ۱۹۵۲ء سے لے کر ۱۹۷۱ء تک شائع ہوئے تھے۔ اس کتاب کی اشاعت کا فیصلہ بزمِ اقبال نے ہیئتِ حاکمہ کے اجلاس منعقدہ ۱۳/ اگست ۱۹۷۱ء میں کیا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی اس کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> ایران نامہ فارسی زبان و ادب اور علوم و افکار سے متعلق ان مقالات کا انتخاب ہے جو بزمِ اقبال کے سہ ماہی مجلّے اقبال میں شائع ہوتے رہے۔ فارسی زبان و ادب اور ایرانیات علامہ اقبال کے پسندیدہ ترین موضوعات میں سے تھے چنانچہ علامہ اقبال نہ صرف اپنے تخلیقی سفر میں پیرِ رومی کی رہبری پر فخر کرتے تھے بلکہ مسلمانانِ پاکستان و ہند اور مسلمانانِ ایران کو ایک ہی تہذیبی وحدت میں دیکھتے تھے۔ (۹)

یہ تمام ''مقالات'' ایک خاص نقطۂ نظر سے مرتّب کیے گئے ہیں۔ وہ خاص نقطۂ نظر یہ ہے کہ پاکستان کے اہلِ علم و دانش کے فارسی زبان و ادب پر لکھے گئے مقالات قارئین کے سامنے آجائیں۔ کتاب میں درج ذیل مقالات شامل کیے گئے ہیں:

۱۔ تاریخِ تصوف کا ایرانی اور ہندی پس منظر (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

۲۔ یورش تاتار اور متصوفانہ افکار و اذکار (سیّد عابد علی عابد)

۳۔ ایوان مدائن اور خاقانی شروانی (انعام الحق کوثر)

۴۔ ذال معجمہ فارسی میں؟ (ڈاکٹر شوکت سبزواری)

۵۔ امیر ابوالنجم ایاز اویماق (سیّد ہاشمی فرید آبادی)

۶۔ مسعود سعد سلمان (ڈاکٹر ناظر حسن زیدی)

۷۔ شاہ ہمدان (ڈاکٹر محمد ریاض)

۸۔ ملا شاہ (ڈاکٹر ظہور الدین)

۹۔ مرزا عبدالقادر بیدل کی شخصیت اور ان کا اُسلوب (ڈاکٹر عبدالغنی)

۱۰۔ اقبال اور غزل (ڈاکٹر سیّد محمد اکرم)

دانشگاہِ فردوسی میں تدریس کے دوران ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے کچھ علمی مقالات مجلّہ دانشکدہ فردوسی میں شائع ہوئے۔ اِن میں سے دو قابلِ ذکر ہیں۔ پہلا مقالہ ''اقبال و حافظ'' یہ مقالہ مجلّہ دانش کدہ ادبیات علوم انسانی دانش گاہ فردوسی کے شمارہ نمبر ۳ میں ۱۳۵۲ھ ش کو شائع ہوا۔ اس کے بعد آبان ماہ ۱۳۶۷ھ میں شیراز میں ہونے والے حافظ سیمینار میں پڑھا گیا اور یونیسکو کمیشن کی طرف سے شائع کردہ مجموعہ مقالات بہ عنوان سخنِ اہل دل میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کو ۱۳۶۹ھ ش میں ڈاکٹر عبدالحسین زرّیں کوب نے مرتّب کیا۔ اس مقالے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی حافظ و اقبال کے یہاں مشترک چند علامتوں کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں:

شاهین درشعر حافظ و اقبال علامت مشترک است و عبارت است از توانائی، نیرو، قناعت، استغناء، پروازبلند و بی ریائی این صفات به گفته اقبال درمردانِ باایمان می باشد حافظ هم مانند اقبال شاهین رامظهر قدرت و توانائی فی دانسته است. (۱۰)

ان میں سے دوسرا اہم مقالہ ''احوال وآثار فخر الشعرا یکدل چشتی'' ہے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے یکدل چشتی کے حالاتِ زندگی بڑی محنت سے اکٹھے کر کے لکھے ہیں اور یکدل چشتی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی یکدل چشتی کے بارے میں لکھتے ہیں:

یکدل در نظم و نثر فارسی سبک خاصی داشت و درزمان خود یکی از معزز ترین و دانشمند ترین افرادشمرده می شد تدریس زبان فارسی، شعر، تاریخ و تحقیق ادبی مشاغل محبوب یکدل بود. معاصرین وی اظهاردارند که مهاراجه رنجیت سنگھ از یکدل خواهش کرد که استخدام دربارِ بعنوانمشاورِ امور مذهبی قبول کند، اما یکدل گفت که مادرم اجازه نمی دهدومی گوید که "پیشه آبائی تو معلمی ست نه که چاکری" واز مهاراجه عذر خواهی کرد. مهاراجه ازا ستعماع ایں کلام بجای اظهار نار

ضیای در هاى انعاو كرام بريكدل باز كرد. (11)

مجلہ دانش کدہ فردوسی کے علاوہ ان کے متعدد فارسی مقالات سہ ماہی دانش، اسلام آباد میں بھی شائع ہوئے۔ ان میں سے دو یہ ہیں:

۱۔ واژہ ھای اُردو در آثار قدیم عربی

۲۔ استاد ار جمند دکتر وحید قریشی

واژہ ھای اُردو در آثار قدیم عربی یا قدیم عربی کتابوں میں اُردو الفاظ، ڈاکٹر صاحب کا اہم تحقیقی مقالہ ہے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے فارسی کی اہم کتابوں **سلسلۃ التواریخ**، **سفرنامہ حسن سیرافی**، **فتوح البلدان**، **کتاب المسالک والممالک**، **عجائب الہند**، **معادن الجواہر**، **اشکال البلاد**، **احسن التقاسیم** اور **کتاب الہند** کے متون میں شامل ایسے الفاظ کی نشاندہی کی ہے جو اب اُردو زبان کا حصہ ہیں۔ مثلاً ابوزید السیرافی کی کتاب **سلسلۃ التواریخ** میں اُردو کے جو الفاظ موجود ہیں اُن میں ناریل (نارجیل)، طاقن (دکن)، صندل (چندن) وغیرہ۔ **فتوح البلدان** میں سے بدھ (بد)، جٹ (زط)، ٹھاکر (تھاکر)۔ **کتاب المسالک والممالک** سے مہاراجہ، جال اور بھار۔ **کتاب الہند** سے بنیا (بانیا)، بٹیر (بارجہ)، ڈولی (ہنڈول)، پلنگ (پلنج)۔ **اشکال البلاد** سے لیموں، وغیرہ کی نشاندہی کی ہے۔ اس مقالے کے آخر میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

> اگرچه این فهرست کلمات چندان طولانی نیست بازهم تعداد کلمات دراین فهرست از فهرست پروفسور زخا و بیشتر می باشد او عقیده دارد که قبل از البیرونی نویسنده های عربی زبلن بیش از ٦ کلمۂ هندی بکارنبر ده اند. (12)

دوسرا مقالہ استاد ار جمند دکتر وحید قریشی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی شخصیت اور خدمات سے متعلق لکھتے ہیں:

> یکی از دانشمندان برجسته وا ساتید مجرب که از ربع قرنِ گزشته ادبیات فارسی رادر شبه قاره گسترش داده و می دهد، دکترو حید قریشی می باشند. نامشان بعنوانِ پژوهشگرِ زبان و ادب و فرهنگ شناسِ طرازِ اوّل بینِ شرق شناسان احتیاج به

معرفی ندارد. چون آثار استاد از سالیان دراز در گسترش دانش و فرهنگ و ادبیات پاکستان و ایران نقش خود را ایفا می کند.

دکتر وحید قریشی درعلوم معقول ومنقول ادبیات فارسی و اُردو وانگلیسی محققاً صاحب نظر هستند و شکی نیست که دراین زمینه ها تا لیفات پر ارزش وی علاقمندانِ علم و دانش راراهنمائی میکند. دکتر عبدالوحید قریشی که بانام کوچک "دکتر وحید قریشی" شهره دارند، درسال ۱۹۲۵ درمیانوالی (یکی از شهر ستان های پنجاب، پاکستان) چشم به دنیا گشو دند. درسال ۱۹۴۴ م از دانشکدئه دولتی لاهورباخذ درجۂ لیسانس نائل گردیدند و در سال ۱۹۴۶ م از دانشگاه پنجاب لاهور فوق لیسانس د ر زبان ادب فارسی و در سال ۱۹۵۰ م فو ق لیسانس در تاریخ گر فتند. درسال ۱۹۵۲ م باخذ دکتری (Ph.D) در ادبیات فارسی و در ۱۹۶۵ م فوق دکتری (D.Lit) در ادبیات اُردو از همین دانشگاه موفق شدند. در دورنه دانشگاهی از ۱۹۴۷ م الی ۱۹۵۰ م بطور محقق بورسیه از بورس الفرد پتیاله استفاده نمودند۔(۱۳)

مقالہ بہ عنوان ''موقعیت زبان فارسی در مدارس دینی پاکستان'' بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں پاکستانی مدارس میں فارسی تدریس کی صورتِ حال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ مقالہ تہران یونیورسٹی میں فارسی اساتذہ کے چوتھے سیمینار میں پڑھا گیا۔ اس مقالے میں سے ایک اقتباس دیکھیے:

درمدارس دینی فارسی در درجۂ متوسط تدریس می شود و تقریباً یک ملیون شاگرد در این مدارس زبانِ فارسی را یادمی گیرند این ء تعداد قابلِ لحاظی است و ازعدنه مجموع شاگردان فارسی دبیر ستان هاو کالج هاودانشگاه هابه مراتب

بیشتر و بلکہ چندین برابر است.(۱۴)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا فارسی زبان میں ایک اور اہم تحقیقی کام پاکستان میں بیرونی ممالک کے اداروں کی ثقافتی خدمات پر ہے۔ اس کتاب کا عنوان ہے، **فعالیتھای فرہنگی موسسات خارجی در پاکستان**۔ یہ کتاب سفارت ایران کے ثقافتی ادارے رایزنی فرہنگی جمہوری اسلامی ایران، اسلام آباد کی فرمائش پر لکھی گئی ہے۔ ابھی شائع نہیں ہوئی۔ اس کتاب کا مسودہ کلچرل قونصلیٹ، اسلام آباد میں بھی موجود ہے۔ یہ اس زمانے کی تصنیف ہے جب ۱۵ر جون ۲۰۰۰ء میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی مقتدرہ قومی زبان کی ملازمت سے سبک دوش ہوئے اور کچھ مدت کے لیے ان کی خدمات حکومت ایران کے مذکورہ بالا ثقافتی ادارے نے حاصل کیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس ادارے میں ریسرچ کوارڈینیٹر کے طور پر دسمبر ۲۰۰۰ء تک کام کیا۔ اس کے بعد وہ جنوری ۲۰۰۱ء میں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز میں آ گئے۔ اس کتاب میں جن اداروں کی ثقافتی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے انھیں درج ذیل عنوانات کے تحت شامل کیا گیا ہے:

۱۔ **فعالیتھای فرهنگی سفارت بریتانیا در پاکستان**
(پاکستان میں سفارت برطانیہ کی ثقافتی سرگرمیاں)

۲۔ **فعالیتھای فرهنگی سفارت کانادا در پاکستان**
(پاکستان میں سفارتِ کینیڈا کی ثقافتی سرگرمیاں)

۳۔ **فعالیتھای فرهنگی ملل متحد در پاکستان**
(پاکستان میں اقوام متحدہ کی ثقافتی سرگرمیاں)

۴۔ **فعالیتھای فرهنگی سفارت ژاپن در پاکستان**
(پاکستان میں سفارتِ جاپان کی ثقافتی سرگرمیاں)

۵۔ **فعالیتھای فرهنگی بنیاد آغا خان در پاکستان**
(پاکستان میں آغا خان فاؤنڈیشن کی ثقافتی سرگرمیاں)

ڈاکٹر صاحب کے فارسی کاموں پر ایک اجمالی نظر یوں ڈالی جا سکتی ہے:

الف: فارسی مطبوعات

۱۔ ایران نامہ

۲۔ شاہنامہ اُردو

۳۔ مقدماتِ زبان اُردو (غیر مطبوعہ)، یہ کتاب مشہد یونیورسٹی کے اُردو نصاب میں بھی شامل ہے۔

۴۔ فعالیتھای فرہنگی موسساتِ خارجی در پاکستان (غیر مطبوعہ)

ب: فارسی مقالات

۱۔ احوال و آثار فخر الشعرا یکدل چشتی

۲۔ حافظ و اقبال

۳۔ حرفی چند در بارہ اقبال لاہوری

۴۔ اقبال شخص و شاعر

۵۔ دو نقش مہم در ترجمہ شاہنامہ اُردو

۶۔ استاد ارجمند دکتر وحید قریشی

۷۔ البیرونی

۸۔ واژہ ھای اُردو در آثار قدیم عربی

۹۔ اقبال شاعر نو آور د توانا

۱۰۔ موقعیت زبانِ فارسی در مدارس دینی پاکستان (غیر مطبوعہ)

تحقیق و تدوین کے علاوہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے فارسی زبان میں کچھ نظمیں بھی لکھیں جن میں سے بعض ایران کے اخبارات میں شائع ہوئیں۔ بطور مثال امام خمینی کی ایران میں واپسی پر ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی نظم تہران کے اخبارات میں شائع ہوئی اور امام خمینی کی وفات پر اُن کا نظم کیا ہوا مادۂ تاریخ بھی ایرانی جرائد میں شائع ہوا۔ امام خمینی کی ایران میں آمد پر ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا موزوں کیا ہوا قطعۂ تاریخ درج ذیل ہے:

خیر مقدم به امام خمینیؒ رهبر انقلابِ ایران

چو خورشید شهامت بعدِ مدت آشکار آمد

ضیای دیده ها افزود وهم دل را قرار آمد

بمیدانِ صداقت چون امام پخته کار آمد

بـه استقبـالِ او خـلـقـی قـطـار انـد ر قطـار آمـد
دلِ مـحـزون مـابشـگـفـت و حـاصـل شد مرادِ ما
بسـر آمـد خـزان و در گـلسـتـان نـوبهـار آمـد
زجـور و ظـلـم، اوهـر گـز نـه اظهارِ ملالـی کـرد
هـمـه مـال و مـنـالِ او بـراهِ حق نثـار آمـد
نـموده بهـر آزادی هـر آن کـوشـش که ممکن بُد
ربـوده گـوی سبـقـت بیـن که باز آن شهسـوار آمـد
چنانِ شد هر کسی خرم که گنجی یا فت بی پایا ن
مـغـنـی خـوش غـزل بسـرود و درنـغمـه هزار آمد
شـنیـد ستـم سحر شادی کنانِ چون قدسیان گفتند
بـرای خـدمـتِ دیـن مـحـمـد جـان نثـار آمـد
زدل چـون خـواستـم سال نبرد حق و باطل، گفت
"خـمـیـنـی رهـبـر مـا حـق پـرسـتـان" کامگار آمد"(۱۵)

۱۹۷۹ء

ایران میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی تدریسی خدمات سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۹ء تک مشہد یونیورسٹی (ایران) میں تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔ وہ وہاں تقریباً چھ سال تک پاکستان شناسی، اقبالیات اور تاریخِ زبانِ اُردو کے موضوعات پڑھاتے رہے۔ ایران میں تدریس کے سلسلے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا تجربہ طویل ہے۔ ایران کے متعدد شہروں اور بالخصوص مشہدِ مقدس میں ان کے رفقا اور دوستوں کی تعداد سیکڑوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بڑے صاحبزادے نوید گوہر ایران میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ ایران میں ان کی ملازمت کی مدت تقریباً آٹھ سال پر محیط ہے۔ مشہد کے بعض جید علما اور اہلِ علم سے ان کے ذاتی اور گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ ان میں ڈاکٹر جلال متینی، ڈاکٹر غلام حسین یوسفی، ڈاکٹر جواد حدیدی، ڈاکٹر رحیم عفیفی، استاد فرخ خراسانی، ڈاکٹر علوی مقدم آقائے گلچین معانی اور ڈاکٹر جعفر شہیدی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر نگینہ کاظمی سے بھی انھوں نے ملاقات کی

تھی۔ ایران سے واپسی پر پاکستان میں بھی انھوں نے اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی تدریس کو اپنایا۔ ثقافتی کونسل ایران، اسلام آباد کی طرف سے دائر فارسی کلاسوں میں تدریس کی۔ یہ کلاسیں اُن کلاسوں سے الگ ہیں جو خانہ فرہنگِ ایران، راولپنڈی میں جاری ہیں۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی فارسی خدمات کا ایران میں اعتراف

مشہد یونی ورسٹی کے قیام کے دوران اُن کی فارسی زبان میں تدریس اور فارسی بول چال کا اعتراف نہ صرف ان کے شاگردوں کو تھا بلکہ ان کے رفقائے کار بھی اسے تسلیم کرتے تھے۔ جن بزرگانِ ادبیاتِ ایران سے اُن کے دوستانہ مراسم تھے اُن میں ایک شخصیت ڈاکٹر غلام حسین یوسفی کی بھی تھی، جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین یوسفی نے ان کے بارے میں کئی اہم تاثرات دیے۔ مثلاً ایک موقع پر انھوں نے ڈاکٹر عارف نوشاہی سے کہا کہ گوہر نوشاہی ایک نوجوان کی حیثیت سے یونیورسٹی کے ماحول میں داخل ہوئے۔ ایک سنجیدہ اور پختہ کار محقق اور استاد کی حیثیت سے اپنے فرائض ادا کر کے رخصت ہوئے۔ ہم انھیں اپنے ہم منصب اور ہم ردیف لوگوں میں شمار کرتے ہیں۔ اسلام آباد قیام کے بعد ایرانی کلچرل کونسل اور دیگر اہلِ علم نے انھیں ہمیشہ اپنے برابر جگہ دی۔ جب ایرانی کلچرل قونصلیٹ، اسلام آباد سے فارسی مجلّہ دانش سے شائع ہوا، اس کے اجرا کے فوری بعد ڈاکٹر گوہر صاحب کے فارسی میں لکھے گئے اکثر مضامین اس مجلّے میں شائع ہوئے۔ ایرانی ثقافتی قونصلیٹ کی شائع کردہ کشف المحجوب (مرتبہ ڈاکٹر محمد حسین تسبیحی) کی تدوین میں جو کوتاہیاں اور کمزوریاں راہ پا گئی تھیں ڈاکٹر صاحب نے ان پر گرفت کی اور ایک مفصل تبصرہ کیا۔ جس کا فارسی ترجمہ ایک ایرانی اہل قلم آقائے داکان نے کیا جو ایران میں شائع ہوا۔ ایران کی مختلف وزارتوں کے مجلّوں میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی تصانیف بالخصوص فرہنگ مشترک کی اطلاع شائع ہوئی۔ فرہنگ مشترک پر وزارت مذہبی امور کے خبرنامے میں ایک خبر اور فرہنگ مشترک کا رنگین گرد پوش شائع ہوا ہے۔ اس تبصرے کا اقتباس بھی قارئین کی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

> فرهنگ لغات مشترک فارسی بین زبانهای کشور های آسیای میانه و اُردو توسط فرهنگستان زبان و ادبیات اُردو در پاکستان منتشر شد. این کتاب که لغات مشترک فارسی رایج در بین

زبانهای ده کشور پاکستان، ترکیه، آذربایجان، قزاقستان ترکمنستان، تاجیکستان، از بکستان، قرقیز ستان، افغانستان و ایران رابا آوانگاری حروف لاتین نشان می دهد کاری است که توسط آقای دکتر گوهر نوشاهی صورت پذیر فته و باهمت آقای افتخار عارف رئیس فرهنگستان زبان اُردو با جلدی زیبا منتشر گردیده است. فرهنگ مشترک در قطع وزیری و در ۵۳۸ صفحه و باتیر اژ یک هزار نسخه برای اولین بار در سال ۱۹۹۷ انتشار یافته است۔ (۱۶)

اسی پرچے کے شمارہ نمبر ۴۶ میں فرہنگ مشترک پر تفصیلی تبصرہ شائع ہوا جو مدیر خبر نامہ کی طرف سے ہے۔ یہ تبصرہ پاکستان میں فارسی زبان کے فروغ کے ذکر میں شائع کیا گیا ہے۔ یہ تبصرہ دراصل فرہنگ مشترک کی اشاعت کے سلسلے میں اسلام آباد میں منعقد ہونے والی تقریب کی روداد ہے، جس کا آغاز یوں ہوتا ہے:

به منظور معرفی کتاب فرهنگ مشترک به جامعه ادبی پاکستان و تجلیل از نو یسنده آن، دکتر "گوهر نوشاهی" به اهتمام رایزنی فرهنگی ج. ا. ا. در پاکستان و با هکاری فرهنگستان زبان اُردوی پاکستان و انجمن فرهنگی اکو، مراسم رونمایی این کتاب در هتل هالیدی شهر اسلام آبادبر گزار شد. (۱۷)

ایران کی ایک یونیورسٹی کے استاد محمد امام جمعہ نے فرہنگ مشترک پر ایک مفصّل مقالہ قلم بند کیا جو ایران میں شائع ہوا۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

- دامن فکر بلند آسان نمی آید به دست سر دمی پجیدبه خود تا مصرعی سوزن کند فرهنگ مشترک مه مؤلف به گرد آوری پنجهزار واژه پرداخته است در واقع پنجهزار از فرهنگ مشترک است که با همکاری محققانی که نام آنان در مقدمه آمده است و از آنها برای

اشتراک معنی در تلفظ و محاوره مد د گرفته است و افزون بر آن به چهار ده مآخذ مهم مراجعه تطبیقی و نقد ی داشته است.

- حسن انتخاب عنوان کتاب که خارج از محدود ده لغت صرف است خود جای گفتار مفصلی رامی طلبد دراین کتاب که باده ردیف و بربالای هر ردیف نام کشور آمده است و یک ردیف برای نوشتار انگیسی هر واژه اختصاص داده است شرط سهولت نگاه عمیق رابر روند فرهنگ مشترک در منطقه پیش می آورد و به کاربرد لغات و اژگان که ریشه در زبان فارسی داشته و قرنها مورد استفاده در منطقه بوده و زبان رسمی محسوب می شده است ملحوظ شده است.
- مؤلف به مباحث لغوی دستوری زبانشناسی نپرداخته است که این خود دلپذیری دیگری دارد. باید یاد آورشد که صدای در خور بلندای فرهنگ است که به جامعه منطقه ای مامی دهد باید دست سر یزاد گفت و بر آن روی آورد بر این غنیمت و گنج فراموش شده بارش نگرش را آحاد مردم منطقه به فراسوی آن و بامعنی و غنی که برخی ز لغات دارد، به تصویر کشید و ازین نظر است که کتاب در ابتدای انتشار کمیاب شده است و توفیق دستیابی به آن در کتابفروشی هانیست.
- نگارنده این و جیز برآن شد که تعدادی از لغات راکه یک فرهنگ عمومی و اعتقادی و ایمانی و اسلامی دارد جمع آوری تندو یادآور شود که چگونه اتحاد و پیوندماوراء یک لغت و کلمه ریشه دار بوده است اگر فراموش و نسیان بنا بر توهیت های زمانی وسیاسی بر آن کشیده شده است اینک و سیله مؤ لف محترم قد کشیده است و از پشت دیوار های سیاه الحاد پر تو افشانی داشته است.

فرہنگ مشترک پر جہاں اہلِ علم و دانش نے تبصرے کیے وہاں شعرا نے اپنے منظوم

خیالات کا اظہار بھی کیا۔ ڈاکٹر محمد حسین تسبیحی (رہا) نے فرہنگ مشترک کی اشاعت پر اپنے منظوم خیالات پیش کیے جو مقتدرہ قومی زبان کے مجلے اخبارِ اُردو میں شائع ہوئے دیکھئے:

مشترک فرهنگ "ای سی او" به میدان آمده
افتخار "ای سی او" خورشید تابان آمده
عروة الوثقای ای سی او بود در ملک پاک
با زبانِ مردم شاه خُراسان آمده
متفخر ایرانیان و مظهر زنده دلان
زینت باغ محبت ماه خوبان آمده
نوگل باغ ادب شد مشترک فرهنگ ما
کاروان فارسی جلوه نمایان آمده
گوهرنوشاهی و فرهنگ پاک مشترک
ای سی او شرین زبان یار سخندان آمده
ده زبان شد مشترک فرهنگ اسلامی کنون
همچو آن حَبلِ المتین از نص قرآن آمده
دانی آن احمد حسن گوهر شناس باستان
افتخار عارف و ذو علمِ ایران آمده
اتحادِ این سه تن در ای. سی. او. شد مشترک
مقتدره فرهنگ نوشاهی غزل خوان آمده
شیخ رشید احمد وزیر پاک دولت را امین
هم ثقافت هم سیاحت را بهاران آمده
آسیای مرکزی باجمله کشور های آن
مظهر فرهنگ اسلامی شکوفان آمده
آن که زد سکه به نام ای سی او در این زمین
فارس و اُردو نگر شیرین زبانان آمده

مــرد مــردان حــقیقت خــالق فــرهنگ مــا
از بــخـــارا و ســمـــر قــنـد و ز تهــران آمــده
رایــزن فــرهنگ ایــرانــی بــه پــاکستــان زمین
گــویــا جــلــوه گــر آیــات رحــمــان آمــده
ایــن هــمــه شــور و نــوای نثــر و نظم شــاعــری
بــوی جــو ی مــولــیان را یــاد انســان آمــده
رونــمــائــی اینــک آمــد کــوشــش نوشــاهیــان
مشتــرک فــرهنگ نــوشــاهــی گلستان آمده
من که خواندم مشترک فرهنگ ای سی او کنون
آفــریــن بــادا بــه آنــان کــه هــمــه دان آمــده
روشــنــی بــخشــد بــه مافرهنگ ناب اشتراک
تــرک و تــاجیــک، آذری شور نیستان آمده
ایــن "رهــا" پیــوستــهٔ فــرهنگیان خوش سخن
تــا کــه خــورشــیــد ادب چون مهر تــابــان آمده (۱۸)

فارسی خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی کو حکومتِ ایران نے دو مرتبہ سرکاری مہمان بنایا۔ ان دوروں کی تفصیل اخبارات میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ چار مرتبہ فارسی اساتذہ کے اجتماعات اور دیگر سیمناروں میں شرکت کے لیے تہران یونیورسٹی انھیں مدعو کر چکی ہے، جن میں انھوں نے اہم مقالات پیش کیے ہیں۔ یہ مقالات ان مذاکروں کے مطبوعہ مواد میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ ایران نے انھیں دو مرتبہ سکہ طلائی بطور میڈل پیش کیا، ایک مرتبہ پاکستان میں اور ایک مرتبہ ایران میں۔ ڈاکٹر صاحب کی فارسی خدمات پر ایران کے ٹیلی ویژن صداؤ سیمانِ ایران نے متعدد پروگرام ضبط کیے ہیں۔ دو انٹرویو صداؤ سیمانِ ایران (تہران) کے مشہور کمپئیر آقای امیری نے کیے جن کے کیسٹ ڈاکٹر صاحب کے پاس موجود ہیں۔ ایک پروگرام اسلام آباد میں اُردو میں ریکارڈ کیا گیا جو تہران میں بھی دکھایا

گیا۔ صداوسیمانِ ایران نے پاکستان کے کلچر پر عید، محرم وغیرہ کے حوالے سے ڈاکٹر گوہر نوشاہی سے انٹرویو کیے، یہ بھی متعدد ہیں۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے بیٹے نوید گوہر، جو مشہد میں پیدا ہوئے، ان کی ولادت پر ایرانی شاعر رضا افضلی نے ایک منظوم تہنیت نامہ لکھا اور مشہد کے نہایت نفیس کاتب سے کتابت کروا کر فریم کی صورت میں ڈاکٹر صاحب کو پیش کیا جو اُن کے گھر موجود ہے۔ ایران کے معروف شاعر ڈاکٹر محمد حسین تسبیحی نے ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا قصیدہ لکھا جس میں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

گوهر خوبان بود، گوهر نوشاهیان
دلبر نازان بُوَد، گوهر نوشاهیان
مِهر و محبت کُنَد، لُطف و عُطوفت کُنَد
شیخَ غزلخوان بُوَد، گوهر نوشاهیان
طُرفۂ فَرزانگی، جوهرِ پر مایگی
صفدرِ میدان بُوَد، گوهر نوشاهیان
مَردِ یقین و صفا، گشتۂ سفیر وفَ
رازِ نیستان بُوَد، گوهر نوشاهیان
فارسی و اردو بیان، بلبل هر دو زبان
شعر و ادب دان بُوَد، گوهر نوشاهیان

اس کے علاوہ بھی ڈاکٹر محمد حسین تسبیحی رہا نے ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی فارسی خدمات اعتراف میں وقتاً فوقتاً اشعار کی صورت میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

ایران میں ڈاکٹر صاحب کی خدمات کا اعتراف اب تک کیا جاتا ہے۔ وہ ایران کلچرل قونصلیٹ کے فارسی مجلّے دانش کی مجلسِ مشاورت میں بھی شامل ہیں اور یہی حیثیت قونصلیٹ کے اُردو مجلّے پیامِ آشنا میں بھی انھیں حاصل ہے۔ ایران کی متعدد یونیورسٹیوں کا علمی دورہ کر چکے ہیں، جن میں دانشگاہِ اصفہان، دانشگاہِ تہران، دانشگاہِ شیراز اور دانشگاہِ تبریز قابلِ ذکر ہیں۔

حوالہ جات

پہلا باب
اُردو تحقیق کی روایت اور دبستانِ لاہور

۱۔ ڈاکٹر گیان چند، تحقیق کا فن، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء، ص ۱۲۔

۲۔ عبدالرزاق قریشی، فنِ تحقیق، مشمولہ: اُردو میں اصول تحقیق، جلد اوّل، ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، جون ۱۹۸۶ء، ص ۷۷۔

۳۔ سر سیّد احمد خان، آثار الصنادید، کان پور پریس، ۱۹۰۴ء، ص ۳۔

۴۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق، سر سیّد احمد خان حالات و افکار، کراچی، انجمن ترقیِ اُردو پاکستان، ۱۹۷۵ء، ص ۳۶۔

۵۔ ڈاکٹر محمود الٰہی، اُردو میں جدید تحقیق کا آغاز، مشمولہ اُردو میں اصولِ تحقیق جلد (دوم)، مرتبہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، اسلام آباد ورلڈ ویژن پبلشرز، ۲۰۰۱ء، ص ۷۳۔

۶۔ ڈاکٹر وحید قریشی، مطالعہِ حالی، لاہور، اُردو بک سٹال، ۱۹۶۱ء، ص ۲۳۔

۷۔ حیاتِ جاوید (دیباچہ اوّل)، لاہور، فروری ۱۹۵۷ء، ص ۶۹۔

۸۔ شبلی نعمانی، الفاروق، ایم زمان اینڈ سنز، س۔ن، ص ۱۱-۱۲۔

۹۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، سر سیّد احمد خان اور اُن کے نامور رفقا کی اُردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء، ص ۱۳۹۔

۱۰۔ مالک رام، اُردو میں تحقیق (مضمون)، مشمولہ اُردو میں اصولِ تحقیق (جلد دوم)، ص ۱۰۵۔

۱۱۔ عبدالغفار شاہین، ڈاکٹر وحید قریشی بحیثیت مدوّن (مقالہ برائے ایم فل اُردو)، علامہ اقبال

اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۲۴-۲۳۔

۱۲۔ رشید حسن خان، ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، لاہور، نیو ایج پبلشرز، ۱۹۹۸ء، ص ۱۱۲-۱۱۳۔

۱۳۔ ڈاکٹر وحید قریشی، تحقیق کے تقاضے (مضمون)، مشمولہ اُردو میں اصولِ تحقیق (جلد اوّل)، ص ۲۸-۲۵۔

۱۴۔ ڈاکٹر وحید قریشی، دیباچہ کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ، لاہور، مکتبہ ادب جدید، ۱۹۶۵ء، ص ۹۔

۱۵۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، پاکستان میں ادبی تحقیق (مضمون)، مشمولہ ماہنامہ آہنگ، فروری ۱۹۹۰ء، ص ۱۹۔

۱۶۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی و ادبی خدمات (جلد اول)، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۳ء، ص ۲۸۸۔

۱۷۔ مالک رام؛ اُردو میں تحقیق (مضمون)، مشمولہ اُردو میں اصولِ تحقیق (جلد دوم)، ص ۸۸-۸۷۔

۱۸۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، ارمغانِ علمی (مرتبہ)، مجلسِ ارمغانِ علمی، لاہور، ۱۹۵۵ء، حصہ انگریزی، ص ۲۹۔

۱۹۔ قاسم محمود (مرتب)، انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا، شاہکار بکس فاؤنڈیشن، کراچی، ص ۸۲۶۔

۲۰۔ ڈاکٹر وحید قریشی، تحقیق کے تقاضے (مضمون)، مشمولہ اُردو میں اصولِ تحقیق (جلد اوّل)، ص ۲۶۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۲۵۔

۲۲۔ ڈاکٹر روبینہ ناز، ڈاکٹر وحید قریشی کی علمی و تحقیقی خدمات (مقالہ)، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۱۲۔

۲۳۔ ڈاکٹر انور سدید، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، اے ایچ پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۶۱۱۔

۲۴۔ عبدالغفار شاہین، ڈاکٹر وحید قریشی بحیثیت مدوّن، ص ۵۔

۲۵۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ڈاکٹر وحید قریشی شخصیت اور فن، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۶ء، ص ۲۷۔

۲۶۔ قاسم محمود (مرتب)، انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا، ص ۷۰۳۔

۲۷۔ عبدالسلام (نگران)، اُردو انسائیکلوپیڈیا، فیروز سنز، لاہور، تیسرا ایڈیشن، جنوری ۱۹۸۴ء، ص ۳۷۹۔

۲۸۔ قاسم محمود (مرتب)، انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا، ص ۸۷۷۔

دوسرا باب
ڈاکٹر گوہر نوشاہی، سوانح اور شخصیت

۱۔ راقم الحروف کا ڈاکٹر گوہر نوشاہی سے انٹرویو: بتاریخ ۱۳/ اکتوبر ۲۰۰۸ء، بمقام: الحیات، بھارہ کہو، اسلام آباد۔
۲۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں) محمد حیات قادری نوشاہی شرق پوری، گلزارِ نوشاہی، لاہور، اسلامیہ سٹیم پریس، ۱۹۳۴ء، ص ۱۵۲۔
۳۔ ایضاً، ص ۱۵۴۔
۴۔ اذکار الصالحین (قلمی)، مولانا محمد حیات نوشاہی، مخزونہ کتب خانہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی۔
۵۔ راقم الحروف کا ڈاکٹر گوہر نوشاہی سے انٹرویو: بتاریخ ۱۳/ اکتوبر ۲۰۰۸ء، بمقام: الحیات، بھارہ کہو، اسلام آباد۔
۶۔ تہمینہ نذیر، ڈاکٹر گوہر نوشاہی سوانح اور علمی وادبی خدمات، مقالہ برائے ایم۔اے اُردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء، ص ۲۵۔
۷۔ راقم الحروف کا ڈاکٹر گوہر نوشاہی سے انٹرویو: بتاریخ ۱۷/ اکتوبر ۲۰۰۸ء، بمقام: الحیات، بھارہ کہو، اسلام آباد۔
۸۔ گلزارِ نوشاہی، ص ۱۴۸۔
۹۔ نصرت نوشاہی، مختصر حالات حضرت میاں محمد حیات نوشاہی، شاد باغ لاہور، جولائی ۱۹۹۳ء، ص ۵۔
۱۰۔ ایضاً، ص ۵
۱۱۔ ایضاً، ص ۵
۱۲۔ ایضاً، ص ۶
۱۳۔ بحوالہ: جامع انسائیکلوپیڈیا، مدیرِ اعلیٰ حامد علی خاں، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، س ن۔
۱۴۔ نصرت نوشاہی، مختصر حالات حضرت میاں محمد حیات نوشاہی، ص ۷۔

۱۵۔ ایضاً،ص۱۰۔

۱۶۔ راقم الحروف کا ڈاکٹر گوہر نوشاہی سے انٹرویو: بتاریخ ۱۷/۱۷ اکتوبر ۲۰۰۸ء، بمقام: الحیات، بھارہ کہو، اسلام آباد۔

۱۷۔ ایضاً

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ ایضاً

۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ نصرت نوشاہی، مختصر حالات حضرت میاں محمد حیات نوشاہی، ص۶۔

۲۲۔ پروفیسر عطاالرحمٰن، گوہر شناسی (مضمون)، الادب، اسلامیہ ڈگری کالج، قصور، ۹۸-۱۹۹۷ء، ص۴۰۷۔

۲۳۔ راقم الحروف کا ڈاکٹر گوہر نوشاہی سے انٹرویو: بتاریخ ۱۷/۱۷ اکتوبر ۲۰۰۸ء، بمقام: الحیات، بھارہ کہو، اسلام آباد۔

۲۴۔ نصرت نوشاہی، مختصر حالات حضرت میاں محمد حیات نوشاہی، ص۱۶۔

۲۵۔ راقم الحروف کا ڈاکٹر گوہر نوشاہی سے انٹرویو: بتاریخ ۱۷/۱۷ اکتوبر ۲۰۰۸ء، بمقام: الحیات، بھارہ کہو، اسلام آباد۔

۲۶۔ مکتوب غلام مصطفیٰ نوشاہی بنام مولانا محمد حیات نوشاہی، ۱۹۳۹ء۔

۲۷۔ تہمینہ نذیر، ڈاکٹر گوہر نوشاہی سوانح اور علمی وادبی خدمات، ص۳۰۔

۲۸۔ رفعت ناہید، ''خشک ہونٹوں کا گیت''، مشمولہ ماہنامہ ادب لطیف، لاہور، ۱۹۶۸ء۔

۲۹۔ تہمینہ نذیر، ڈاکٹر گوہر نوشاہی سوانح اور علمی وادبی خدمات، ص۳۴۔

۳۰۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، سیّد امتیاز علی تاج: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص۵۴ تا ۵۶۔

۳۱۔ ایضاً،ص۵۷

۳۲۔ پروفیسر عطاالرحمٰن، گوہر شناسی (مضمون)، ص۴۷۱۔

۳۳۔ راقم الحروف کا ڈاکٹر گوہر نوشاہی سے انٹرویو: بتاریخ ۱۷/۱۷ اکتوبر ۲۰۰۸ء، بمقام: الحیات، بھارہ

کہو، اسلام آباد۔

۳۴۔ ایضاً

۳۵۔ ایضاً

۳۶۔ مکتوبِ صابر کیفی بیرسٹر بنام راقم الحروف، ۹ر ستمبر ۲۰۰۸ء۔

۳۷۔ مکتوبِ عبدالغفور شاہ قاسم بنام راقم الحروف، ۶ر ستمبر ۲۰۰۸ء۔

۳۸۔ مکتوب ڈاکٹر طارق ہاشمی بنام راقم الحروف ۱۵ر مئی ۲۰۰۹ء۔

۳۹۔ مکتوب ڈاکٹر شفیق انجم بنام راقم الحروف ۶ر ستمبر ۲۰۰۸۔

۴۰۔ پروفیسر عطاالرحمٰن، گوہر شناسی (مضمون)، ص ۱۷۴۔

۴۱۔ رفعت ناہید، خشک ہونٹوں کا گیت۔

۴۲۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، پیش لفظ تحقیقی زاویے، (مصنفہ) ڈاکٹر گوہر نوشاہی، اسلام آباد، مجلس فروغ تحقیق، ۱۹۹۱ء، ص ۷۔

۴۳۔ افتخار عارف سے راقم الحروف کا انٹرویو، بتاریخ ۲۶ر مئی ۲۰۰۹ء، بمقام مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔

۴۴۔ راقم الحروف کا محترمہ فرحت گوہر سے انٹرویو، مورخہ ۲۵ر اکتوبر ۲۰۰۸ء۔

۴۵۔ راقم الحروف کا نوید گوہر سے انٹرویو، مورخہ ۲۵ر اکتوبر ۲۰۰۸ء، بوقت ۲:۰۰ بجے سہ پہر۔

۴۶۔ تاثرات فرید گوہر، بذریعہ ٹیلی فون، ۲۷ر اکتوبر ۲۰۰۸ء۔

تیسرا باب
ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی تحقیقی خدمات

۱۔ راشد حمید، مکالمہ: ڈاکٹر گوہر نوشاہی، روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی - اسلام آباد، ۱۳/ جون ۲۰۰۰ء، ادبی صفحہ۔

۲۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، تحقیق و تنقید (مضمون)، مشمولہ ''اُردو میں اصولِ تحقیق'' (جلد اوّل)، ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۳۲۔

۳۔ ایضاً، ص ۳۰

۴۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، میں اور میری تحقیق، اسلام آباد، پی ٹی وی II پروگرام، ۷/ جنوری ۱۹۹۷ء۔

۵۔ ایضاً

۶۔ ڈاکٹر سفیر اختر، لاہور کے چشتی خاندان کی اُردو خدمات (تبصرہ)، سہ ماہی نقطہ نظر، اسلام آباد، اپریل ۱۹۸۷ء، ص ۳۲۔

۷۔ ڈاکٹر محمد یوسف عباسی، تجزیہ ''لاہور کے چشتی خاندان کی اُردو خدمات''، مجلّہ الادب، گورنمنٹ اسلامیہ ڈگری کالج، قصور، ۹۸-۱۹۹۷، ص ۴۸۰۔

۸۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی، لاہور کے چشتی خاندان کی اُردو خدمات (تبصرہ)، مجلّہ الادب: ص ۴۶۱۔

۹۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، تاثرات، مشمولہ مجلّہ الادب، ص ۴۶۱۔

۱۰۔ ڈاکٹر وحید قریشی، تاثرات، مشمولہ مجلّہ الادب، ص ۴۶۱۔

۱۱۔ تہمینہ نذیر، ڈاکٹر گوہر نوشاہی سوانح اور علمی خدمات (مقالہ برائے ایم. اے اُردو)، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد، ص ۸۳۔

۱۲۔ ڈاکٹر سفیر اختر، لاہور کے چشتی خاندان کی اُردو خدمات (تبصرہ)، مشمولہ گوہر نوشاہی ایک مطالعہ، مرتبہ ڈاکٹر شفیق انجم، راولپنڈی، نقش گر پبلی کیشنز، مارچ ۲۰۰۹ء، ص ۳۹-۳۸۔

۱۳۔ ڈاکٹر جمیل جالبی (پیش لفظ)، تحقیقی زاویے: اسلام آباد، مجلس فروغ تحقیق، نومبر ۱۹۹۱ء، ص ۷-۸۔

۱۴۔ رفاقت علی شاہد، تحقیقی زاویے ایک نظر، مشمولہ مجلّہ الادب، ص ۴۸۲-۴۸۳۔

۱۵۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، تحقیقی زاویے، ص ۲۳۴۔

۱۶۔ رفاقت علی شاہد، تحقیقی زاویے ایک نظر، مشمولہ مجلّہ الادب، ص ۴۸۴۔

۱۷۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ادبی زاویے، اسلام آباد، مجلس فروغِ تحقیق، دسمبر ۱۹۹۳ء، ص ۱۱۔

۱۸۔ ڈاکٹر صدیق شبلی (پیش لفظ)، ادبی زاویے، ص ۸۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۷۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۷، ۸۔

۲۱۔ Professor Nazir Siddiqi "Naushahi Great Resharch Scholar" The News International 1997 Wednessday 19 Feb.

۲۲۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، یادگارِ سرسیّد، اسلام آباد، مجلس فروغِ تحقیق، ۱۹۹۶ء، ص ۱۵-۱۶۔

۲۳۔ مشفق خواجہ، ''حرفے چند''، مشمولہ یادگارِ سرسیّد، ص ۱۲-۱۳۔

۲۴۔ Professor Nazir Siddiqi "Naushahi Great Resharch Scholar"The News International 1997 Wednessday 19 Feb.

۲۵۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، مطالعۂ غالب، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء، ص ۷۔

۲۶۔ راقم الحروف کا ڈاکٹر گوہر نوشاہی سے انٹرویو: بتاریخ ۱۷ اکتوبر ۲۰۰۸ء، بمقام ''الحیات''، بھارہ کہو، اسلام آباد۔

۲۷۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، مطالعۂ غالب، ص ۷۔

۲۸۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی (فلیپ) مطالعۂ غالب۔

۲۹۔ ڈاکٹر خلیق انجم [تجزیہ]، لاہور میں اُردو شاعری کی روایت، مشمولہ مجلّہ الادب، ص ۴۷۵، ۴۷۷۔

۳۰۔ ڈاکٹر محمود الرحمٰن (تبصرہ)، مطبوعہ اخبارِ اُردو، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، اگست ۱۹۹۷ء۔

۳۱۔ افتخار عارف (پیش لفظ)، قیامِ پاکستان پر ایک محنت کش کا روزنامچہ، (مرتبہ) ڈاکٹر گوہر نوشاہی، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۱۹۹۷ء، ص ۴۔

۳۲۔ Mushir Anwar "A No Body's Diary" dialy The News Sep.7,1997.

۳۳۔ ڈاکٹر محمد صدیق شبلی (تبصرہ)، مطبوعہ روزنامہ پاکستان، اسلام آباد، ۲۴/مارچ ۱۹۹۷ء۔

۳۴۔ افتخار عارف (پیش لفظ)، فرہنگ مشترک، [تدوین] ڈاکٹر گوہر نوشاہی، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۷۔

۳۵۔ پروفیسر نظیر صدیقی (تعارف)، فرہنگ مشترک، ماہنامہ اخبارِ اُردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ستمبر ۱۹۹۷ء، ص ۳۲۔

۳۶۔ پروفیسر فتح محمد ملک، فرہنگِ یک زبان ودہ الوان، ماہنامہ اخبار اُردو، اپریل ۱۹۹۷ء، ص ۱۲۔

۳۷۔ ڈاکٹر عارف نوشاہی، فرہنگ مشترک (تبصرہ)، ماہنامہ اُردو، نومبر ۱۹۹۷ء، ص ا۔

۳۸۔ پروفیسر نظیر صدیقی، فرہنگ مشترک (تبصرہ)، ماہنامہ اخبار اُردو، ستمبر ۱۹۹۷ء، ص ۳۴۔

۳۹۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۳ء، ص ۷۔

۴۰۔ ڈاکٹر حبیب نثار، ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ تحقیقی وتنقیدی جائزہ (تبصرہ)، مشمولہ دکن کی مخصوص شعری اصناف اور دوسرے مضامین، اُردو ریسرچ سنٹر، حیدر آباد (بھارت)، جنوری ۱۹۹۵ء، ص ۶۹۔

۴۱۔ انوار فیروز، تبصرہ مطبوعہ روز نامہ نوائے، ۲۷ر جولائی ۱۹۹۴ء۔

۴۲۔ ڈاکٹر حبیب نثار، ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ، مشمولہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی ایک مطالعہ، ص ۶۴ تا ۶۶۔

۴۳۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی [دیباچہ]، مطالعۂ اقبال، لاہور، بزمِ اقبال، ۱۹۸۲ء۔

۴۴۔ محمد جہانگیر خان (پیش لفظ)، مطالعۂ اقبال، ص ۳۴۔

۴۵۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، سیّد امتیاز علی تاج: شخصیت اور فن، اسلام آباد، اکادمی ادبیاتِ پاکستان، ۱۹۹۹ء، ص ۹۔

۴۶۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ڈاکٹر وحید قریشی شخصیت اور فن، اسلام آباد، اکادمی ادبیاتِ پاکستان، ۲۰۰۶ء، ص ۷۔

۴۷۔ افتخار عارف (پیش نامہ)، ڈاکٹر وحید قریشی شخصیت اور فن، ص ۷۔

۴۸۔ ڈاکٹر اعجاز راہی، کالم ویو پوائنٹ، روزنامہ مشرق، پشاور، ۲۶ر نومبر ۱۹۹۱ء۔

چوتھا باب
ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی تدوینی خدمات

۱۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، اصولِ تحقیق و ترتیب متن، لاہو، سنگت پبلشرز، ۲۰۰۳ء، ص ۳۰۔

۲۔ ایضاً، ص ۳۱/۳۲۔

۳۔ خلیق انجم، متنی تنقید، لاہور، سنگت پبلشرز، ۲۰۰۴ء، ص ۷۔

۴۔ تہمینہ نذیر، ڈاکٹر گوہر نوشاہی سوانح اور علمی خدمات (مقالہ برائے ایم اے اُردو)، اسلام آباد، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، ۲۰۰۰ء، ص ۶۸۔

۵۔ راشد حمید، ڈاکٹر گوہر نوشاہی سے مکالمہ، مطبوعہ روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی، ۱۳/ جون ۲۰۰۰ء۔

۶۔ پروفیسر نذیر احمد تصحیح و تحقیقِ متن، کراچی، ادارۂ یادگارِ سرسیّد، ۲۰۰۰ء، ص ۱۔

۷۔ مکتوب ڈاکٹر عطش درّانی بنام راقم الحروف، مکتوبہ ۴/ جون ۲۰۰۹ء۔

۸۔ ڈاکٹر شفیق انجم کا مراسلہ بنام راقم الحروف، ۱۰/ ستمبر ۲۰۰۸ء۔

۹۔ ڈاکٹر عبدالغفور شاہ قاسم کا مراسلہ بنام راقم الحروف، ۶/ ستمبر ۲۰۰۸ء۔

۱۰۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی: متنی تحقیق یا متنی تنقید (مضمون)، مشمولہ اُردو تحقیق (مرتبہ عطش درّانی)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۳ء، ص ۲۰۹۔

۱۱۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، فلیپ، تحقیقی زاویے، اسلام آباد، مجلس فروغ تحقیق، ۱۹۹۱ء۔

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ مقصود حسنی، ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے تحقیقی اور لسانی نظریے (مضمون)، مشمولہ مجلّہ الادب، قصور، گورنمنٹ اسلامیہ ڈگری کالج، ۹۸-۱۹۹۷ء، ص ۴۸۸۔

۱۴۔ ڈاکٹر جمیل جالبی (پیش لفظ)، تحقیقی زاویے، ص ۷-۸۔

۱۵۔ گوہر نوشاہی، بیتال پچیسی، لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۶۵ء، ص ۱۷ تا ۷۳۔

۱۶۔ گوہر نوشاہی، بیتال پچیسی (مضمون)، مشمولہ تحقیقی زاویے، ص ۲۶-۲۷۔

۱۷۔ گوہر نوشاہی، نتائج المعانی، لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۶۷ء، ص۲۔
۱۸۔ ایضاً، ص۳۔
۱۹۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، نتائج المعانی (مضمون)، مشمولہ تحقیقی زاویے، ص۴۹۔
۲۰۔ محمد سلیم الرحمٰن (فلیپ) نتائج المعانی۔
۲۱۔ راقم الحروف کا ڈاکٹر گوہر نوشاہی سے انٹرویو: ۱۷/ اکتوبر ۲۰۰۸ء، بمقام ''الحیات''، بھارہ کہو، اسلام آباد۔
۲۲۔ گوہر نوشاہی، یادگارِ چشتی، لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب، اکتوبر ۱۹۷۵ء، ص۲۔
۲۳۔ گوہر نوشاہی، مثنوی ہشت عدل مع واسوخت، لاہور، مجلس ترقی ادب، فروری ۱۹۸۱ء، ص۱۔
۲۴۔ ایضاً، ص۸۶۔
۲۵۔ ایضاً، ص۸۹۔
۲۶۔ ایضاً، ص۱۷-۱۶۔
۲۷۔ ایضاً، ص۱۸۔
۲۸۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، تحقیقی زاویے، ص۶۷۔
۲۹۔ مکتوب ڈاکٹر عطش درّانی بنام راقم الحروف، مرقومہ ۴/ جون ۲۰۰۹ء۔
۳۰۔ ڈاکٹر انور سدید (تبصرہ)، مطبوعہ اوراق، لاہور، سالنامہ ۱۹۸۷ء۔
۳۱۔ گوہر نوشاہی، پنجابی شکوہ، لاہور، انتشاراتِ پنجابی ادبی اکادمی، جنوری ۱۹۶۴ء، ص۱۳-۱۷۔
۳۲۔ راقم الحروف کا جناب افتخار عارف سے انٹرویو: بتاریخ ۲۶/ مئی ۲۰۰۹ء، بمقام مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔
۳۳۔ راشد حمید: غالب کی خاندانی پنشن اور دیگر امور (تبصرہ)، روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی، ۳۰/ دسمبر ۱۹۹۲ء۔
۳۴۔ ڈاکٹر خلیق انجم، کتاب اور صاحب کتاب (تبصرہ)، مشمولہ سہ ماہی اُردو ادب، دہلی، شمارہ جولائی اگست ستمبر ۱۹۹۹ء، ص۱۰۹۔
۳۵۔ پروفیسر فتح محمد ملک: جائزہ زبان اُردو- پنجاب (پیش لفظ)، مرتبہ خواجہ عبدالوحید (مرحوم)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء۔

۳۶۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، مقدمہ جائزہ زبان اُردو (پنجاب)، ص ۱۱۔
۳۷۔ ایضاً، ص ۱۳۔
۳۸۔ راقم الحروف کا ڈاکٹر گوہر نوشاہی سے انٹرویو، بمقام "الحیات"، بتاریخ ۱۹ر مارچ ۲۰۰۵ء بر بھارہ کہو، اسلام آباد۔
۳۹۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی (مرتب)، نقشِ خیال، اُسلوب، اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۸ء، ص ۱۳۔
۴۰۔ ڈاکٹر رشید امجد، (بیک ٹائٹل) نقشِ خیال، تدوین ڈاکٹر گوہر نوشاہی۔

پانچواں باب
ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی فارسی خدمات

۱۔ تہمینہ نذیر، ڈاکٹر گوہر نوشاہی سوانح اور علمی خدمات (مقالہ برائے ایم.اے اُردو)، اسلام آباد، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، ۲۰۰۰ء، ص ۳۳۔

۲۔ ایضاً، ص ۳۲۔

۳۔ راقم الحروف کا ڈاکٹر گوہر نوشاہی سے انٹرویو: ۱۷ر اکتوبر ۲۰۰۸ء، بمقام الحیات، بھارہ کہو، اسلام آباد۔

۴۔ ڈاکٹر جمیل جالبی پیش لفظ، تحقیقی زاویے، اسلام آباد، مجلس فروغِ تحقیق، نومبر ۱۹۹۱ء، ص ۷۔

۵۔ راقم الحروف کا جناب افتخار عارف سے انٹرویو: ۲۶ر مئی ۲۰۰۹ء، بمقام: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔

۶۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، مول چند کی ایک نادر تصنیف، سہ ماہی اُردو ادب، انجمن ترقی اُردو ہند، دہلی، شمارہ ۳، ۱۹۹۱ء، ص ۷۷۔

۷۔ ایضاً، ص ۸۱۔

۸۔ "The News International, Wednesday April, 23, 1997.

۹۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ایران نامہ، کلب روڈ، لاہور، بزمِ اقبال، ۱۹۷۱ء، ص ز۔

۱۰۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، اقبال و حافظ، مجلّہ دانشکدہ ادبیات و علوم انسانی، دانشگاہِ فردوسی، شمارہ سوم، خزاں ۱۳۵۲ش، ص ۴۲۵۔

۱۱۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، احوال و آثار فخر الشعرا یکدل چشتی، مجلّہ دانشگاہِ ادبیات و علوم انسانی دانشگاہِ فردوسی، شمارہ اوّل، سال سیزدھم، بہار ۲۵۳۶ش، ص ۱۶۰-۱۶۱۔

۱۲۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، واژہای اُردو در آثار قدیمِ عربی، سہ ماہی دانش، اسلام آباد، شمارہ نمبر ۱۷-۱۸، بہار ۱۳۶۸ھ ش، ص ۱۷۳۔

۱۳۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، استاد ارجمند دکتر وحید قریشی، سہ ماہی دانش، اسلام آباد، شمارہ نمبر ۱۶، زمستان

۱۳۶۷ھ، ص ۷۸۔

۱۴۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، موقعیت زبانِ فارسی در مدارس دینی پاکستان، ''چکیدہ مقالات'' چہار مین مجمع بین المللی گسترش زبان وادبیات فارسی، تہران، ۱۳۸۲ش، ص ۵۴۔

۱۵۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، خیر مقدم بہ امام خمینیؒ، رہبر انقلاب اسلامی، چشم انداز ماہنامہ فرہنگی ھنری، شمارہ نمبر ۱۱۰، بھمن ۱۳۷۶ھ ش، ص ۹۶۔

۱۶۔ خبر نامہ شورای گسترش زبان وادبیات فارسی، وزارتِ فرہنگ وارشاد اسلامی، تہران، شمارہ نمبر ۴، ۱۳۷۷ھ ش، ص ۱۷-۱۸۔

۱۷۔ مراسمِ معرفی کتاب ''فرہنگ مشترک'' خبر نامہ شورای گسترش زبان وادبیات فارسی، وزارتِ فرہنگ وارشاد اسلامی، تہران، شمارہ نمبر ۴۶، ۱۳۷۷ھ ش، ص ۵۔

۱۸۔ ڈاکٹر محمد حسین تسبیحی (رہا)، فرہنگ مشترک، اخبار اُردو، اسلام آباد، دسمبر ۱۹۹۷ء، ص ۱۷۔

مآخذ و مصادر

الف: بنیادی مآخذ

(ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی تالیفات، تحقیقات اور تدوینات)

۱۔ پنجابی شکوہ، پنجابی ادبی اکادمی لاہور، ۱۹۶۴ء۔ (تدوین)

۲۔ بیتال پچیسی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۵ء۔ (تدوین)

۳۔ نتائج المعانی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۷ء۔ (تدوین)

۴۔ مثنوی ہشت عدل، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۱ء۔ (تدوین)

۵۔ ایران نامہ، بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۷۱ء۔ (مرتبہ)

۶۔ مثنوی رمز العشق، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۲ء۔ (تدوین)

۷۔ مطالعہ اقبال، بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۸۳ء۔ (تالیف)

۸۔ مختصر قانونی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء۔ (مرتبہ)

۹۔ پدماوتِ اُردو، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۶ء۔ (تدوین)

۱۰۔ اُردو املا رموز و اوقاف، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء۔ (تالیف)

۱۱۔ شاہنامہ اُردو، ایران کلچرل سنٹر اسلام آباد، ۱۹۹۰ء۔ (تدوین)

۱۲۔ لاہور میں اُردو شاعری کی روایت، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۱ء۔ (تحقیق)

۱۳۔ تحقیقی زاویے، اسلام آباد، مجلس فروغِ تحقیق، ۱۹۹۱ء۔ (تحقیق)

۱۴۔ مطالعہِ غالب، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۱ء (تحقیق)

۱۵۔ ادبی زاویے، مجلس فروغِ تحقیق اسلام آباد ۱۹۹۳ء۔ (تنقید)

۱۶۔ چشتی خاندان کے اُردو خدمات، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۳ء۔ (تحقیق)

۱۷۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ، نقوش، اُردو بازار لاہور، ۱۹۹۳ء؛ ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۹۳ء (تالیف)

۱۸۔ یادگار سر سیّد، مجلس فروغِ تحقیق اسلام آباد، ۱۹۹۶ء۔ (ترتیب وتدوین)

۱۹۔ قیام پاکستان پر ایک محنت کش کا ورزنامچہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۹۷ء۔ (ترتیب وتدوین)

۲۰۔ فرہنگ مشترک، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۹۷ء (تالیف)

۲۱۔ غالب کی خاندانی پنشن اور دیگر امور، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء۔ (تدوین)

۲۲۔ سیّد امتیاز علی تاج شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات اسلام آباد، پاکستان ۱۹۹۹ء۔ (تحقیق)

۲۳۔ جائزہ زبانِ اُردو پنجاب، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء۔ (تدوین)

۲۴۔ ڈاکٹر وحید قریشی شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات اسلام آباد پاکستان، ۲۰۰۶ء۔ (تحقیق)

۲۵۔ نقش خیال، اُسلوب اسلام آباد ۲۰۰۸ء۔ (تدوین)

ب: ثانوی مآخذ

۲۶۔ ابوالکمال برق، سیّد نوشاہی، تذکرہ شعرائے نوشاہی، نوشاہی اشاعتی مشن بریڈ فورڈ یو کے، ۱۹۲۹ء۔

۲۷۔ اشرف علی، تحفظ دستاویزات وکتب خانہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء۔

۲۸۔ اعجاز راہی، ڈاکٹر، روداد سیمینار اصولِ تحقیق، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء۔

۲۹۔ افتخار جالب، نئی شاعری / ایک مطالعہ، نئی مطبوعات سرکلر روڈ، لاہور، جنوری ۱۹۶۶ء۔

۳۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، اے ایچ پبلشرز، لاہور، اپریل ۱۹۹۶ء۔

۳۱۔ ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر، اُردو میں اُصولِ تحقیق، (جلد اوّل) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، جون ۱۹۸۶ء۔

۳۲۔ ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر، اُردو میں اُصولِ تحقیق، (جلد دوم) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، جون ۱۹۸۸ء۔

۳۳۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، سرِ ورق، نظم آزاد، مطبع عالیہ لاہور، ۱۹۷۸ء۔

۳۴۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ادبی تحقیق کے اصول، مقتدرہ قومی زبان، (طبع اوّل) اسلام آباد،

۱۹۹۲ء۔
۳۵۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تاریخ، سنگ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء۔
۳۶۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، نقد سرشار، مطبع عالیہ لاہور، ۱۹۸۶ء۔
۳۷۔ تلک سنگھ، ڈاکٹر، نویں شود گیان، پرکاش سنتھان، دلی، ۱۹۸۲ء۔
۳۸۔ تنویر احمد علوی، ڈاکٹر، اصولِ تحقیق و ترتیبِ متن، سنگت پبلیشرز لاہور، ۲۰۰۳ء۔
۳۹۔ جمیل احمد رضوی، سیّد، کتابیات ڈاکٹر سیّد عبداللہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء۔
۴۰۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادبی تحقیق، مجلس ترقی ادب (طبع اوّل) لاہور، ۱۹۹۴ء۔
۴۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادبِ اُردو، (جلد دوم) مجلس ترقی ادب، (طبع سوم) لاہور، ۱۹۹۴ء؛ (جلد اوّل) مجلس ترقی ادب، (طبع چہارم) لاہور، ۱۹۹۵ء۔
۴۲۔ حافظ محمود شیرانی، پنجاب میں اُردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء۔
۴۳۔ حامد علی خان (مرتب) جامع انسائیکلوپیڈیا علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۸ء۔
۴۴۔ حبیب نثار، ڈاکٹر، دکن کی مخصوص شعری اصناف اور دوسرے مضامین، اُردو ریسرچ سنٹر، حیدر آباد، جنوری ۱۹۹۵ء۔
۴۵۔ حسن اختر ملک، ڈاکٹر اقبالِ تحقیقی مقالہ، یونیورسل بکس لاہور، ۱۹۸۸ء۔
۴۶۔ حسن اختر ملک، ڈاکٹر، تہذیب و تحقیق، یونیورسل بکس ۱۴۰ اے اُردو بازار لاہور، ۱۹۸۵ء۔
۴۷۔ حمید احمد خاں، دیوانِ غالب (نسخہ حمیدیہ) مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء۔
۴۸۔ خالد سعید، انٹرویو، میں اور میری تحقیق، پی۔ ٹی۔ وی۔ ٹو، پروگرام ۱۹۹۷ء۔
۴۹۔ خلیفہ عبدالحکیم ڈاکٹر، فکرِ اقبال، المعارف گنج بخش روڈ، لاہور، ۱۹۸۸ء۔
۵۰۔ خلیق انجم، ڈاکٹر، متنی تنقید، انجمن ترقیِ اُردو ہند نئی دہلی، (طبع دوم) ۲۰۰۶ء۔
۵۱۔ خلیق انجم، متنی تنقید، کروڑی مل کالج دہلی یونیورسٹی دہلی، ۲۰۰۴ء۔
۵۲۔ خلیق انجم، ڈاکٹر، غالب کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی خاکہ، غالب انسٹیٹیوٹ نئی دہلی، ۲۰۰۵ء۔
۵۳۔ دلوی، عبدالستار، ادبی اور لسانی تحقیق، شعبۂ اُردو، بمبئی یونیورسٹی، (طبع اوّل) بمبئی،

۱۹۸۴ء۔
۵۴۔ رشید حسن خاں، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، نیو ایج پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۸ء۔
۵۵۔ رشید حسن خاں، ادبی تحقیق علی گڑھ، ۱۹۷۸ء۔
۵۶۔ رشید حسن خاں، دیباچہ، گلزارِ نسیم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۷ء۔
۵۷۔ رفاقت علی شاہد، مرتب، تحقیق شناسی، القمر انٹر پرائزز لاہور، (طبع اوّل) ۲۰۰۳ء۔
۵۸۔ رفیع الدین ہاشمی، عارف نوشاہی، تحسین فراقی، مرتبین، ارمغانِ علمی، القمر انٹر پرائزز لاہور، اوّل ۱۹۹۹ء۔
۵۹۔ سلام سندیلوی، ڈاکٹر، ادب کا تنقیدی مطالعہ، میری لائبریری لاہور، ۱۹۶۴ء۔
۶۰۔ سیّد عبداللہ، ڈاکٹر، سر سیّد احمد خان اور ان کے نام ور رفقا کی اُردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء
۶۱۔ سیّد عبداللہ، ڈاکٹر، شعرائے اُردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۵۲ء۔
۶۲۔ ش اختر، ڈاکٹر، تحقیق کے طریقہ کار، تاج پریس لاہور، ۱۹۸۵ء۔
۶۳۔ شرافت، سیّد شریف احمد نوشاہی، تذکرہ شعرائے نوشاہیہ، اورینٹل پبلی کیشنز، لاہور، پاکستان ۲۰۰۷ء۔
۶۴۔ صفیہ بانو، ڈاکٹر، انجمن پنجاب تاریخ و خدمات، (طبع اوّل) کفایت اکیڈمی کراچی، ۱۹۷۸ء۔
۶۵۔ طاہر نسیم، اُردو کانفرنس خانیوال، مطلع پبلی کیشنز خانیوال، ۱۹۸۹ء۔
۶۶۔ عبدالرزاق قریشی، مبادیاتِ تحقیق، (طبع اوّل) ادبی پبلشرز بمبئی، ۱۹۶۸ء۔
۶۷۔ عبدالودود، قاضی، عبدالحق بحیثیت محقق، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ۱۹۹۵ء۔
۶۸۔ عطش درّانی، ڈاکٹر، جدید رسمیاتِ تحقیق، اُردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۵ء۔
۶۹۔ عطش درّانی، ڈاکٹر، مرتب، اُردو تحقیق (منتخب مقالات) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، اوّل، ۲۰۰۳ء۔
۷۰۔ عندلیب شادانی، ڈاکٹر، تحقیق کی روشنی میں، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۳ء۔

۷۱۔ قاسم محمود، سیّد، انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا، شاہکار بک فاؤنڈیشن، کراچی، طبع دوم، ۱۹۹۸ء۔
۷۲۔ کلبِ عابد، پروفیسر، عمادالتحقیق، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۷۸ء۔
۷۳۔ گیان چند، ڈاکٹر، تحقیق کا فن، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء۔
۷۴۔ محمد انور قمر، مطالعہ نقوشِ شرق پور، مقصور پبلشرز، لاہور، س ن۔
۷۵۔ محمد حیات قادری نوشاہی شرق پوری، مولوی، گلزار نوشاہی، اسلامیہ سٹیم پریس لاہور، ۱۹۳۴ء۔
۷۶۔ مظہر محمود شیرانی، ڈاکٹر، حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی خدمات، (جلد اوّل) مجلس ترقی ادب، لاہور، جون ۱۹۹۳ء
۷۷۔ معراج نیر، ڈاکٹر سیّد، بابائے اُردو، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، ابلاغ لاہور، (طبع اوّل) ۱۹۹۵ء۔
۷۸۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر، اُردو تحقیق: صورتِ حال اور تقاضے، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء۔
۷۹۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر، پاکستان میں اُردو تحقیق، انجمن ترقی اُردو کراچی، س۔ن۔
۸۰۔ نذیر احمد، پروفیسر، مرتب، حافظ محمود شیرانی، تحقیقی مطالعے، غالب انسٹیٹیوٹ نئی دہلی، ۱۹۹۱ء۔
۸۱۔ نذیر احمد، پروفیسر، تصحیح و تحقیقِ متن، ادارہ یادگارِ غالب کراچی، ۲۰۰۰ء۔
۸۲۔ نصرت نوشاہی، مختصر حالات حضرت میاں محمد حیات صاحب نوشاہی، شاد باغ لاہور، جولائی ۱۹۸۳ء۔
۸۳۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، مقالاتِ تحقیق، (طبع اوّل) مغربی پاکستان اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۸۔

غیر مطبوعہ مقالات

ایم اے

۱۔ سہینہ نذیر، ڈاکٹر گوہر نوشاہی سوانح اور علمی خدمات، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء۔

ایم فل

۱۔ عبدالغفار شاہین، ڈاکٹر وحید قریشی بحیثیت مدوّن، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۷ء۔

پی ایچ ڈی

۱۔ روبینہ ناز، ڈاکٹر وحید قریشی علمی و تحقیقی خدمات، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد، ۲۰۰۷ء۔

رسائل و جرائد

۱۔ ادبِ لطیف، (ماہنامہ)، لاہور، ۱۹۶۸ء۔
۲۔ الادب، قصور، گورنمنٹ اسلامیہ ڈگری کالج، ۹۸-۱۹۹۷ء۔
۳۔ سہ ماہی، اُردو ادب، دہلی، انجمن ترقیِ اُردو ہند، شمارہ نمبر ۳، ۱۹۹۱ء۔
۴۔ سہ ماہی، اُردو ادب، نئی دہلی، انجمن ترقی اُردو شمارہ جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۹۹ء۔
۵۔ ماہنامہ، اخبار اُردو، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، اپریل، ۱۹۹۷ء
۶۔ ماہنامہ، اخبار اُردو، ایضاً مئی ۱۹۹۷ء۔
۷۔ ماہنامہ، اخبار اُردو، ایضاً اگست ۱۹۹۷ء۔
۸۔ ماہنامہ، اخبار اُردو، ایضاً ستمبر ۱۹۹۷ء۔
۹۔ ماہنامہ، اخبار اُردو، ایضاً نومبر ۱۹۹۷ء۔
۱۰۔ ماہنامہ، اخبارِ اُردو، ایضاً اپریل ۱۹۹۷ء
۱۱۔ ماہنامہ، اخبار اُردو، ایضاً فروری ۱۹۹۸ء۔
۱۲۔ سال نامہ، اوراق، ۱۹۸۷ء
۱۳۔ آج کل، اُردو تحقیق نمبر دہلی، اگست، ستمبر ۱۹۶۷ء
۱۴۔ ادیب، دہلی، ستمبر، ۱۹۴۰ء
۱۵۔ سہ ماہی، نقطۂ نظر، اسلام آباد، انسٹیٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، اپریل، ستمبر، ۱۹۹۸ء۔
۱۶۔ ماہنامہ، آہنگ، فروری ۱۹۹۰ء۔
۱۷۔ ماہنامہ، چشم انداز فرہنگی ہنری، تہران شمارہ نمبر ۱۰ بہمن ۱۳۷۶ھ ش۔
۱۸۔ خبرنامہ شورای گسترش زبان و ادبیاتِ فارسی، وزارت فرہنگ وارشاد اسلامی، تہران شمارہ

نمبر ۴۲، ۱۳۷۷ھ ش۔
۱۹۔ خبر نامہ شورای گسترش زبان وادبیاتِ فارسی، وزارت فرہنگ وارشاد اسلامی، تہران شمارہ نمبر ۴۶، ۱۳۷۷ھ ش۔
۲۰۔ چکیدہ مقالات چہارمین، مجمع بین المللی گسترش زبان ادبیات فارسی، تہران ۱۳۸۲ اش۔
۲۱۔ مجلّہ دانش گاہِ ادبیات وعلومِ انسانی، و دانشگاہ فردوسی، تہران شمارہ نمبر سیزدھم، بہار ۲۵۳۶ ش۔
۲۲۔ سہ ماہی دانش، اسلام آباد، شمارہ نمبر ۱۷، بہار ۱۳۶۸ھ۔
۲۳۔ سہ ماہی دانش، اسلام آباد، شمارہ نمبر ۱۶ ازمستان ۱۳۶۷ھ۔

اخبارات

۱۔ روزنامہ پاکستان، اسلام آباد، ۲۴ مارچ، ۱۹۹۷ء۔
۲۔ روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی ۲۷ جولائی ۱۹۹۴ء۔
۳۔ روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی ۳۰ ستمبر ۱۹۹۷ء۔
۴۔ روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی ۱۴ دسمبر ۱۹۹۴ء۔
۵۔ روزنامہ مشرق، پشاور ۲۶ نومبر ۱۹۹۱ء۔
۶۔ روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی ۱۳ جون، ۲۰۰۰ء۔
۷۔ روزنامہ جنگ، روالپنڈی، جمعہ ۴ اگست ۲۰۰۰ء۔
۸۔ The News International Wednesday, Feb19, 1997.
۹۔ Daily, Pakistan, Observer Islamabad July, 9, 1993.
۱۰۔ Daily, The news Paper, 7, 1997 .
۱۱۔ The News International Wednessday, 23 April, 1997.
۱۲۔ News Letter, Winter 95.

ضمیمہ

راقم الحروف کا ڈاکٹر گوہر نوشاہی سے انٹرویو

بتاریخ: ۲۵ رجنوری ۲۰۰۹ء

بمقام: الحیات، بھارہ کہو، اسلام آباد

سوال: ڈاکٹر صاحب آپ نے کن کن سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کی؟ نیز یہ بھی فرمائیں کہ دورانِ تعلیم آپ کن کن اساتذہ اور شخصیات سے متاثر ہوئے؟

جواب: میں تقریباً پانچ برس کی عمر میں اسلامیہ پرائمری سکول شرق پور میں داخل کروایا گیا۔ میرے کسان چچا میاں محمد عالم نے میونسپل کمیٹی کے اندارج کے خلاف تاریخ لکھوادی۔ یہی اندارج آخر تک میری تعلیمی اسناد میں رہا اور ہے۔ یہاں سے میں نے چوتھی جماعت پاس کی۔ پانچویں میں گورنمنٹ ہائی سکول شرق پور داخل کرایا گیا۔ چھٹی جماعت میں تھا جب میرے والد صاحب نے لاہور میں سکونت اختیار کی اور مجھے چشتیہ ہائی سکول، لاہور میں داخل کروادیا۔ یہاں سے میں نے ۱۹۵۷ء میں میٹرک کیا۔ ایف۔اے میں داخلے کے لیے میں نے اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ، لاہور کو پسند کیا اور آرٹس میں داخلہ لے لیا۔ اس کلاس میں میرے مضامین میں شماریات بھی شامل تھی جسے بعد میں تبدیل کرنا پڑا۔ بی۔اے اسلامیہ کالج، سول لائنز سے کیا۔ اس کلاس میں میرے مضامین میں نفسیات بھی شامل تھی۔ معاشیات میں نے ایف۔اے میں پڑھی تھی۔ ایم۔اے اُردو کے لیے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں داخلہ لیا۔ اور اسے دو سال میں مکمل کیا۔ پرائمری سکول کے اساتذہ کے نام اس وقت یادداشت سے بجھ چکے ہیں البتہ پہلی جماعت کے استاد یاد ہیں، یہ میاں محمد اکرم تھے جو والدہ کے رشتے سے میرے دُور کے ماموں تھے۔ بہت توجہ، دلچسپی سے پڑھاتے اور دورانِ تعلیم کلاس کا حصہ بن جاتے۔ وہ خوش خط بھی تھے۔

تختیوں پر الف ب پنسل سے لکھ کے دیتے۔ انھی کی رکھی ہوئی بنیاد پر میرا خط ہمیشہ صاف اور قابل قرأت رہا۔ ہائی سکول کے اساتذہ میں دو شخصیتیں ہمیشہ یاد رہیں گی، ایک چشتیہ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر خواجہ صادق حسن بی۔اے اور دوسرے ماسٹر عبداللطیف قریشی۔ یہ دونوں میری تعلیمی ترقی کے لیے ہمیشہ فکر مند رہتے۔ ماسٹر عبداللطیف میرے والد صاحب کے دوستوں میں شامل تھے۔ اِن دونوں کے علاوہ میں نے جن لوگوں سے کسبِ فیض کیا اُن میں ماسٹر عبدالواحد، ماسٹر خورشید عالم اور سائنس کے استاد عارف عبدالمتین قابلِ ذکر ہیں۔ چشتیہ ہائی سکول کے قیام کی سب سے اہم یاد یہ ہے کہ ہماری کلاس کی کھڑکیاں سول سکرٹریٹ کے اس حصے کی طرف کھلتی تھیں جہاں مولانا غلام محمد ترنم مسجد نبوی کے نقشے پر مسجد تعمیر کروا رہے تھے۔ میں نے یہ تعمیر عرصہ دراز تک کلاس کی کھڑکیوں سے دیکھی۔ ہائی سکول کے زمانے میں ہی مولانا غلام محمد ترنم کے اقتداء میں جمعہ کی نماز یں ادا کیں۔ ہمارا گھر چشتیہ ہائی سکول سے تقریباً دواڑھائی کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ ہم پیدل آتے تھے اور جون جولائی کی سخت دھوپ میں بھی نمازِ جمعہ مولانا کے پیچھے ادا کی جاتی تھی۔ اُن کی تقریر کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے کلاس روم میں ایک اچھا استاد لیکچر دے رہا ہو۔ میرے جملے کی ادائیگی میں مولانا ترنم کی آواز بھی شامل ہے۔ اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ کے اساتذہ میں بہت سارے اہم نام ایسے شامل ہیں جنھوں نے میری علمی، ادبی اور فکری تربیت میں کردار ادا کیا۔ فارسی کے دو اساتذہ جن سے عمر بھر کا تعلق قائم ہوا مولانا علم الدین سالک اور ڈاکٹر وحید قریشی، اور اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ میں معاشیات کے استاد پروفیسر عبدالحمید صدیقی تھے۔ جو ترجمان القرآن میں ''شذرات'' لکھتے تھے۔ عبدالحمید صدیقی مہربان اور علمی وجاہت سے بھرپور شخصیت تھے۔ ایک دن انگریزی میں لیکچر دیتے۔ اُن کے پاس زبان کی روانی اور قدرت بے حد وحساب موجود تھی۔ انگریزی میں لیکچر کے دوران ایک لفظ بھولے سے بھی اُردو کا نہیں بولتے تھے۔ لیکچر کا آغاز گڈ مارننگ جنٹل مَین سے اور لیکچر کا اختتام گڈ بائی جنٹل مَین سے ہوتا تھا۔ دوسرے دن اُردو میں لیکچر ہوتا جس میں اوّل سے آخر تک کوئی لفظ انگریزی کا استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ فصاحت ایسی کہ الفاظ دل میں اترتے جاتے تھے، اور خود اعتمادی ایسی کہ لیکچر الہام معلوم ہوتا تھا۔ پروفیسر علم الدین سالک ہر استاد اور طالب علم کے لیے علمی اور اخلاقی تربیت گاہ تھے۔ عرصے تک اُن کی کلاس میں کالر کا بٹن بند کرنے اور سر پر ٹوپی اوڑھ کر بیٹھنے کی پابندی تھی۔ سالک صاحب ہمیں فارسی

پڑھاتے تھے۔ ''بزمِ عروجِ ادب'' کے صدر رہے۔ ''بزم عروجِ ادب'' نے اُن کی سرپرستی میں اسلامیہ کالج کے علمی ماحول کو بامِ عروج تک پہنچا دیا تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے سلسلہ نیاز مندی ایف.اے کے زمانے میں شروع ہوا، لیکن اُن سے زیادہ استفادہ اسلامیہ کالج، سول لائنز میں بی.اے کی تعلیم کے دوران کیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی علم و فضل کے دریا اور میرے آئیڈیل استاد تھے۔ اور اب تک ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں عمرِ نوح عطا فرمائے۔ اسلامیہ کالج، سول لائنز میں جن اساتذہ نے متاثر کیا ان میں سب سے بڑا مقام ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے فارسی اور اُردو تحقیق میں میری تربیت کی اور ڈاکٹر سجاد باقر رضوی نے مجھے ادب کی طرف راغب کیا۔ رضوی صاحب ہمارے استاد ہی نہیں بلکہ اتالیق بھی تھے۔ ان کی شخصیت ہمارے لیے مشعلِ راہ تھی۔ ریلوے روڈ اور سول لائنز کے ہم جماعت دوستوں میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری، سیّد مراتب اختر، ناصر زیدی، بیرسٹر صابر کیفی، وحید اطہر، دانش رضا اور راؤ ارشاد علی ناقابلِ فراموش ہیں۔ میں آج تک اِن کے دامِ محبت میں اسیر ہوں۔ اسلامیہ کالج، سول لائنز میں پروفیسر حمید احمد خاں کی ادبی تربیت ہمیشہ یاد رہے گی۔ وہ ہمارے پرنسپل ہی نہیں بلکہ ہمارے مربّی و مہربان بھی تھے۔ انھوں نے مجھے ایسے وقت میں معاشی سہارا دیا کہ میرے لیے تعلیم کے اخراجات برداشت کرنا دشوار نہیں تو سخت ضرور تھا۔ خاں صاحب نے مجھے کریسنٹ ہوسٹل کے ایک بلاک کا پراکٹر بنایا اور مجھے کریسنٹ ہوسٹل بزم ادب کا سیکرٹری مقرر کیا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اِس بزمِ ادب سے خصوصی انعام دلا کر میرے تعلیمی قرضے کی خوش اُسلوبی سے ادائیگی کو ممکن بنایا۔ اس دور میں مَیں نے کریسنٹ ہوسٹل میں ایک مشاعرہ منعقد کیا جسے اسلامیہ کالج کی تاریخ میں بہترین مشاعرہ قرار دیا گیا۔ اس مشاعرے میں سیّد عابد علی عابد، حفیظ جالندھری اور لاہور میں موجود تمام اعلیٰ و ادنیٰ شعرا کے ساتھ استاد دامن نے بھی شرکت کی، جن کا کسی تعلیمی ادارے میں بحیثیت شاعر آنا اس زمانے میں خلافِ معمول اور اہم سمجھا جاتا تھا۔ کریسنٹ ہوسٹل بزمِ ادب کے سرپرست خواجہ غلام صادق تھے جنھوں نے قدردانی کے طور پر میرے نام کی ایک ٹرافی بزمِ ادب کی سالانہ تقریب کے لیے جاری کروائی۔ یہ خوشگوار یادیں اسلامیہ کالج سے مجھے ذہنی طور پر ہمیشہ وابستہ رکھیں گی۔ یونیورسٹی اورینٹل کالج میں اساتذہ کی ایک گلیکسی موجود تھی جن کے نام آسمانِ علم و ادب پر ماہ و خورشید کی طرح روشن ہیں۔ ان میں سب سے پہلا نام ڈاکٹر سیّد عبداللہ کا

ہے جنھوں نے کلاس کے اجرا کے ساتھ ہی میرا نام بطور محقق اور ادیب دوست کلاس میں متعارف کروایا تھا۔ اس کا ذکر میری ایک کلاس فیلو رفعت ناہید کے مضمون خشک ہونٹوں کا گیت میں موجود ہے جو ادبِ لطیف میں شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ میرے پسندیدہ استاد تھے۔ اُن پر لیکچر وحی کی طرح نازل ہوتا تھا۔ کلاس میں بیٹھے ہوئے طلبہ لیکچر کے دوران اپنے وجود سے بے خبر ہوتے تھے۔ سیّد صاحب گھڑی نہیں پہنتے تھے لیکن وقت پر کلاس میں داخل ہوتے اور عین وقت پر حاضری کا کاغذ مانگ لیتے۔ ایک دفعہ ہم نے سوال کیا کہ سیّد صاحب! آپ گھڑی کے بغیر وقت کا اندازہ کس طرح کرتے ہیں جس پر سیّد صاحب نے فرمایا، میں لفظ گن کر لاتا ہوں اور گن کر بولتا ہوں، جب ختم ہو جاتے ہیں میری کلاس کا وقت ختم ہو جاتا ہے، مجھے گھڑی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ میرے ایم.اے کے مقالے کے نگران بھی تھے۔ یہ مقالہ ''لاہور میں اُردو شاعری کی روایت'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ایم.اے اُردو کے دوران کچھ نام میرے حلقۂ احباب میں شامل ہوئے، اِن میں ریاض احمد چوہدری اور فاروق عثمان قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی سے فرسٹ ائیر سے لے کر پی ایچ.ڈی تک مسلسل شاگردی کا شرف حاصل رہا۔ اللہ تعالیٰ انھیں سلامت رکھے۔

سوال: کس ادبی و علمی ماحول نے آپ کو فکری اور علمی سطح پر متاثر کیا اور آپ کی تحقیقی و ادبی راہوں کے تعین میں نمایاں کردار ادا کیا؟

جواب: اسلامیہ کالج کا ماحول میری علمی و تحقیقی زندگی کی بنیاد ہے۔ اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ میں مشاعرے، مباحثے، محفلِ موسیقی اور بزم عروجِ ادب کی نشستیں ہمارے لیے تربیت کا بہترین وسیلہ تھیں۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں جادو بیان شخصیات کی تقریریں بھی ہماری فکری تربیت کا حصہ بنیں۔ اِن میں مولانا علم الدین سالک، مولانا صلاح الدین احمد، علامہ کفایت حسین اور مولانا عبدالحئ فاروقی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا علم الدین سالک اتنی پاٹ دار آواز میں تقریر کرتے تھے کہ انھیں لاؤڈ سپیکر کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ علامہ اقبال اور حافظ محمود شیرانی کے نام بھی اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ، لاہور میں ہی کانوں میں پڑے اور ان کی شخصیات کو اپنے لیے مثالی بنایا۔ اسلامیہ کالج، سول لائنز میں یہ علمی ادبی ماحول بہت ترقی یافتہ

صورت میں تھا۔ ینگ رائیٹرز کے پلیٹ فارم سے ڈاکٹر سجاد باقر رضوی نے ہماری جوادبی اور فکری تربیت کی، اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ینگ رائیٹرز کنونشن اور لسانی تشکیلات کا سیمینار اسلامیہ کالج، سول لائنز ہی کی یادگاریں ہیں۔ اس کے علاوہ ''شمع تاثیر'' کے نام سے سالانہ مشاعرہ بھی ہماری شعری تربیت کا اثاثہ ہے۔ جس میں استاد شعرا، جن میں یوسف جمال انصاری، اختر اقبال کمالی، سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ناصر کاظمی، انجم رومانی، اور قیوم نظر وغیرہ کے ناموں کے ساتھ ساتھ پروفیسر حمید احمد خان، ڈاکٹر سیّد عبداللہ، ڈاکٹر نذیر احمد (پرنسپل گورنمنٹ کالج) اور پروفیسر محمد دین تاثیر مرحوم کی اہلیہ سلمٰی تاثیر کی شمولیت مشاعرے کی رونق کو دوبالا کرتی تھی۔ شمع تاثیر مشاعرے کا بھی ذکر کرنے کو دل چاہتا ہے۔ سول لائنز، لاہور کے کچھ اور علمی مشاغل کا بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے پروفیسر حافظ احمد یار کی منعقد کی ہوئی ''قرآنی مخطوطات'' کی نمائش اور انجمن فارسی کی طرف سے منعقد کی گئی نادر و نایاب کتابوں کی نمائش اب تک یاد ہے۔ قرآنی مخطوطات کی نمائش میں ہم سب دوستوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس نمائش کی کامیابی باعث ہوئی کہ میری اسلامیات کے پیریڈ میں کم حاضریاں معاف کردی گئیں۔ نایاب کتابوں کی نمائش کا افتتاح ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے ہاتھوں ہوا۔ اُن کی فرمائی ہوئی نادر کتاب کی تعریف اور اُن کی شخصیت کی موجودگی ابھی تک دل ودماغ میں محفوظ ہے۔ سول لائنز میں تعلیم کے دوران ہی مولوی عبدالحق کی کالج میں آمد ہوئی، جہاں ہم نے پہلی مرتبہ مولوی صاحب کو دُور سے دیکھا۔ یونیورسٹی اورینٹل کالج میں حلقۂ شیرانی، حلقۂ اہلِ قلم اور انجمنِ فارسی کی سرگرمیاں میری ذہنی تربیت کا حصہ ہیں۔ انجمنِ فارسی کا سیکرٹری اور حلقۂ اہل قلم کا میں رکن تھا۔ حلقۂ شیرانی کا بھی سیکرٹری تھا، جس کے صدر ڈاکٹر وحید قریشی تھے۔ اس زمانے تک میں لکھنے پڑھنے والوں کی نوجوان صف میں آگیا تھا۔ میرا تعلق مجلس ترقی ادب سے قائم ہوچکا تھا اور مشفق خواجہ جیسے عظیم محقق مجھے برادرانہ شفقت سے نوازرہے تھے۔ یونیورسٹی کے بعد میں مجلس ترقی ادب کے علمی ماحول میں داخل ہوا۔ مجلس میں میری ملازمت مدیر کتب کے طور پر تھی۔ دیگر مدیرانِ کتب میں سیّد عابد علی عابد اور کلب علی فائق شامل تھے۔ سیّد عابد علی عابد کی شخصیت اس زمانے میں فعال نہیں تھی۔ وہ گوناگوں امراض میں مبتلا ہوکر گھر میں رہتے تھے اور مجلس ترقی ادب میں مہینے میں ایک یا دو ماہ کے بعد آتے تھے۔ کلب علی خاں فائق عمررسیدہ تھے۔ نئے ادبی ماحول سے آشنا نہیں تھے۔ اسی صورتِ حال میں سیّد

امتیاز علی تاج کی سرپرستی میں مجلس ترقی ادب کا پورا علمی و ادبی ماحول تاج صاحب کے ہاتھ میں تھا۔ میں مجلس ترقی ادب کی مجلسِ ادارت کے ساتھ ساتھ بزمِ اقبال میں مشاورِ علمی بھی تھا۔ رسالہ اقبال انٹرنیشنل حصہ اُردو کی ارادت بھی میرے پاس تھی۔ سیّد امتیاز علی تاج کی ذات علمی، ادبی اور مجلسی زندگی میں محتاجِ تعارف نہیں۔ مجلس ترقی ادب کا نام صرف امتیاز علی تاج کی وجہ سے معتبر قرار پاتا ہے۔ مجلس کی طرف سے منعقدہ علمی سیمینار، اور نشستوں کا اہتمام بھی میرے ذمے تھا۔ کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر یونس جاوید جب مجلس میں آئے تو اُن کی معاونت بھی مجھے حاصل ہوگئی۔ مجلس ترقی ادب اور ادارہ ثقافت اسلامیہ ہمسایہ ادارے ہیں۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ میں جید علما موجود تھے جن سے میں بہت متاثر ہوا۔ اِن میں سے سب سے بڑا نام شیخ محمد اکرام ہے، جن کی خدمت میں گاہے گاہے حاضری کا موقع ملتا تھا۔ دینی علما میں مولانا جعفر شاہ پھلواری اور مولانا محمد حنیف ندوی کا میری تربیت میں بڑا حصہ ہے۔ یہاں پر اُردو ادب کے مربی اور مجلس کے صدر نشین جسٹس ایس۔اے۔ رحمٰن کا ذکر بھی کرنا چاہیے جو میری معمولی سی علمی کوششوں کو بھی اپنی محبت اور وسعتِ نظر سے بڑا ثابت کرتے رہتے تھے۔ مجلس ترقی ادب سے وابستہ اہلِ علم و ادب ایک گروہ کی صورت میں تھے۔ یہ اجتماع سیکڑوں شخصیات پر مشتمل ہے۔ اِن سب شخصیات کا ایک ایک کر کے ذکر تو نہیں کیا جا سکتا، لیکن میری آنکھیں اُن کی زیارت سے اور میرا دل و دماغ اُن کے فیضان سے منور ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! ایک خالصتاً فنی اور علمی نوعیت کا سوال ہے کہ آپ کے نزدیک تحقیق کا بنیادی منصب کیا ہے؟ سوانحی، متنی اور موضوعاتی تحقیق کے بارے میں آپ کے افضل اور ممتاز خیالات کیا ہیں؟

جواب: لسانی، ادبی اور موضوعاتی تحقیق ایک ہی مقام کی چیزیں ہیں۔ البتہ تحقیق شاید ادب سے زیادہ تاریخ سے تعلق رکھتی ہے۔ کیونکہ تاریخ ہی واقعات سے تعلق پیدا کرتی ہے۔ ادبی اور علمی تحقیق میرا موضوع رہا ہے۔ اس کا شوق زمانۂ طالب علمی سے ڈاکٹر وحید قریشی نے پیدا کیا اور تحقیق کے ایک اہم دبستان سے میرا رشتہ جوڑ دیا، جسے دبستانِ لاہور کہتے ہیں۔ ادبی تحقیق میں تین پہلو نمایاں ہوتے ہیں، سوانحی تحقیق، موضوعاتی تحقیق اور متنی تحقیق۔ سوانحی تحقیق میں تاریخ دانی

کے علم کو پس منظر کے طور پر اہم سمجھا جاتا ہے۔ موضوعاتی تحقیق میں مطالعہ ادب اہم ہوتا ہے۔ اور متنی تحقیق میں تدوینِ متن کے مراحل ضروری قرار پاتے ہیں۔ میرا زیادہ کام سوانحی اور متنی تحقیق سے متعلق ہے۔ موضوعاتی تحقیق کے بارے میں ایک نقطہ ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں اور وہ غالباً حافظ محمود شیرانی کا تبرک ہے کہ کتاب یا تصنیف متن لکھنے والے کی سوانح یعنی اپنے خالق کی سوانح بھی ہوتی ہے اور اپنے موضوع کی نمائندہ بھی۔ میں تحقیق کے اِن تینوں شعبوں میں متنی تحقیق کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں اس لیے کہ متن ہے تو اِس کا مصنف ہے۔ متن کے بغیر مصنف پر تحقیق کا جواز پیدا نہیں ہوتا۔ میں تدوینِ متن اور تصحیحِ متن کو سنتِ الٰہیہ سمجھتا ہوں اور قرآن پاک کی تدوین کے مراحل کو علمِ تدوین کا سب سے بڑا راہنما خیال کرتا ہوں۔ تحقیق کی روِش اور اُسلوب کے بارے میں میرا تعلق لاہور کے دبستانِ تحقیق سے ہے جس کے بانی حافظ محمود شیرانی اور معمار مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر سیّد عبداللہ، سخاوت مرزا، ڈاکٹر وحید قریشی اور مشفق خواجہ ہیں۔ یہ دبستان متن کے استناد کو اہم سمجھتا ہے۔ اور سوانحی کوائف کی تاریخ اور منطق سے سند ضروری سمجھتا ہے۔

سوال: آپ لاہور کے دبستانِ تحقیق سے وابستہ ہیں، اس دبستان کے بنیادی خدوخال کیا ہیں؟

جواب: اُردو تحقیق کو مختلف دبستانوں میں تقسیم کیا گیا ہے، دبستانِ دکن، دبستانِ اعظم گڑھ اور دبستان رام پور وغیرہ۔ اِن میں سے ہر دبستان بعض اہم خصوصیات کی وجہ سے دوسروں سے مختلف ہے۔ انھیں میں سے ایک دبستانِ لاہور بھی ہے۔ اِن دبستانوں کو اگر خصوصیات کے اعتبار سے مختصر ترین الفاظ میں بیان کیا جائے تو کچھ یوں ہوگا، دبستانِ دکن اختلافِ نسخ میں قلمی نسخوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ نظری مباحث میں واقعات کی صحت کا دارومدار ادبی مآخذ پر ہے، تاریخ سے اس کی مطابقت ضروری نہیں۔ تاریخی مآخذ سے حاصل ہونے والی معلومات کو ادبی مواد سے ہم آہنگ نہیں کیا جاتا۔ زبان کے معاملے میں البتہ ان کی کوششوں سے صوتیاتی شعور لسانیات میں ایک مستقل اور سائنسی علم کی حیثیت رکھتا ہے۔ دبستانِ اعظم گڑھ کا دعویٰ ہے کہ اُردو صرف زبان کی حیثیت سے نہیں بلکہ صرف مسلمانوں کی علمی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ دبستانِ اعظم گڑھ میں اُردو تحقیق کو مذہبی علوم کے حوالے سے اور اس کے بنیادی مسائل کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ دبستانِ پٹنہ، جس کے نمائندۂ تحقیق قاضی عبدالودود، ڈاکٹر اختر اورینوی اور ڈاکٹر

مختارالدین آرزو ہیں، صرف بنیادی مآخذ کو اہمیت دیتے ہیں، ثانوی مآخذ کو صرفِ نظر کر دیا جاتا ہے۔اس دبستان میں احتیاط کا عنصر نمایاں ہے، البتہ مخففات کے بے دریغ استعمال سے ان کے ہاں بعض اوقات تحریر کا حسن ماند پڑ جاتا ہے۔ دبستانِ رام پور کے سرکردہ امتیاز خان عرشی ہیں۔ اس دبستان میں تصحیح متن کو اہمیت دی گئی اور ترتیب وحواشی میں تذکروں کے استعمال کا نیا اُسلوب اپنایا گیا۔میرا تعلق تحقیق کے دبستانِ لاہور سے ہے۔اِس دبستان کے نمایاں خدوخال یہ ہیں۔

۱۔ علوم کے مطالعے کی تحقیق میں بنیادی مآخذ کو اہم سمجھا گیا ہے۔

۲۔ ادب کو معاشرتی علوم یعنی تاریخ، معاشیات، فلسفہ، نفسیات اور منطق وغیرہ کے حوالے سے دیکھا گیا ہے۔ تاریخ کو اس نظامِ تحقیق میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ادب سے حاصل کردہ واقعات، سنین اور معلومات کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔

۳۔ اُردو تحقیق کی روایت میں حزم واحتیاط کا اعلیٰ معیار قائم کیا گیا ہے۔

۴۔ تحقیقی عمل میں سہل انگاری اور حوالے کی بے احتیاطیوں کا محاسبہ سختی سے کیا جاتا ہے۔

۵۔ اُردو تحقیق کے لیے مخصوص زبان اپنائی جاتی ہے مثال کے طور پر جملے میں تکرار حشو وزوائد اور آخری درجے کے استعمال سے گریز کیا جاتا ہے۔

۶۔ حوالے اور سند کے بغیر کوئی بیان قابلِ قبول نہیں ہوتا۔

۷۔ بنیادی اور ثانوی مآخذ کے درمیان امتیاز و دلائل کی غفلت کڑیوں کی پوری چھان بین، حوالے کی قدامت کا تعین، رسم خط اور کاغذ کے عہد بہ عہد تغیرات کا احساس، املا کے خصائص کا ادراک اور حوالوں کے اندراج میں اخلاقی قدروں پر سختی سے عمل، اِس دبستان کی اہم خصوصیت ہے۔ دبستانِ لاہور کے بانی حافظ محمود شیرانی تھے جنھوں نے اپنی مثالی تحقیق سے اس دبستان کے کام کی راہیں متعین کیں اور اپنے خیالات اور عمل سے متفق محققین کی ایک جماعت پیدا کی۔ اس جماعت میں ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر سیّد عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، مشفق خواجہ، ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے کارناموں نے اُردو ادب کی تحقیق کو خاص طور پر متاثر کیا ہے۔ مالک رام، مولانا غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر خلیق انجم، غرضیکہ تمام اہم اور سنجیدہ محققین دبستانِ لاہور سے وابستہ بزرگوں کی روشِ کار سے متاثر ہیں۔

سوال: لاہور میں اُردو شاعری کی قدیم روایت پر آپ نے کچھ کام کیا ہے۔ کیا آپ کے نزدیک تاریخِ ادب میں شامل ہونے کے لیے یہ مواد تسلی بخش اور کافی ہے؟

جواب: نہیں! لاہور میں اُردو شاعری کی روایت پر ابھی بہت کام کرنے کی گنجائش ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے نوجوان محققین کو اِس طرف ضرور توجہ دینی چاہیے۔ لاہور علم و ادب کا ہمیشہ سے مرکز رہا ہے۔ اس کی پیش گوئی اور خوش خبری حضرت مجدد الف ثانی کے ہاں بھی موجود ہے اور سر سیّد کے استاد مولانا فیض الحسن سہارن پوری کے اس شعر میں بھی:

بناوٹ اس میں نہیں ہے کہ ان دنوں لاہور
بھلے بُرے کا ٹھکانا ہے دوست دشمن کا

مولانا کا یہ شعر ۱۸۵۷ء کے بعد لاہور میں قائم ہونے والی بزمِ ادب سے ہے جس میں اُردو کے عظیم الشان شاعر، ادیب اور مورّخ موجود تھے۔ آج بھی لاہور کو اس نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے اور لاہور کے ادب پر ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر سہیل احمد خان، ڈاکٹر سلیم ملک اور دیگر اساتذہ کو طالب علموں کی راہنمائی کرنا چاہیے۔ اس سے تاریخِ ادب کی تدوین میں مدد ملے گی اور اس میں سچائیاں شامل ہوں گی۔

سوال: آپ پنجاب کے حوالے سے خاصا تحقیقی مواد منظرِ عام پر لائے ہیں، آپ اس طرف کن وجوہ کی بنا پر راغب ہوئے؟

جواب: پنجاب کے حوالے سے تحقیقی کام جب حافظ محمود شیرانی نے شروع کیا تو علامہ اقبال تک نے یہ محسوس کیا کہ یہ نہ صرف سنجیدہ عمل ہے بلکہ اس موضوع پر مزید کام ہونا چاہیے۔ پنجاب میں پیدا ہونے والے اُردو ادب کو ابھی تک سنجیدگی سے نہیں دیکھا گیا۔ آج تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ بارڈر پار کے اُردو ادب میں کیا چیز زبان کے علاوہ اہم ہے جو پنجاب یا پاکستان کے دیگر حصوں میں نہیں۔ میرے خیال میں پنجاب اُردو ادب کی دریافت، اس کو منظرِ عام پر لانے اور اُس سے بہرہ برداری کرنے کے امکانات بہت زیادہ ہیں جو ابھی تک ہماری تحقیق کا حصہ قرار نہیں پائے۔ یہی حال پاکستان کے دوسرے حصوں کے اُردو ادب کا ہے۔ بے اعتنائی کا سبب اس کی اہمیت کو نظر انداز کرنا اور اُسے مقابلتاً کمزور ادب تصور کرنا بھی ہے۔ یہ سوچ کوئی صحت مند سوچ

نہیں بلکہ احساسِ کمتری پر مبنی سوچ ہے۔ ولی دکنی کا دیوان جب رائج ہوا تو اس کی تاثیر جس زمانے میں شمالی ہند میں گئی، بالکل اسی زمانے میں برصغیر کے مغربی حصے یعنی پاکستان میں وارد ہوئی۔ پاکستان کے مختلف حصوں میں میر وسودا کے معاصر اُردو شعرا دریافت ہو چکے ہیں جن پر ولی دکنی کی غزل کا براہِ راست اثر موجود ہے۔ اگر دہلی اور شمالی ہند کے مختلف حصوں کے شعرا لسانی اور ادبی اعتبار سے اہم ہیں تو پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے قدیم شعرا کیوں نہیں۔ ہمارے پاس مخطوطات کے انبار موجود ہیں اگر ہم تعصب کا نقاب اتار دیں تو پاکستان کے تمام حصوں کے اُردو ادب پر بالعموم اور پنجاب کے اُردو ادب پر بالخصوص ہماری تحقیق کے دروازے کُھل جائیں گے۔ پنجاب پر اس لیے کہ پنجاب کی مختلف یونیورسٹیوں، لائبریریوں اور اہلِ علم کے ذاتی کتب خانوں میں اُردو مطبوعات اور مخطوطات کی کثرت موجود ہے۔ میں نے پنجاب کے اُردو ادب پر اس لیے کام کیا ہے کہ جب تاریخِ ادب کو سنجیدگی اور حقیقت نگاری سے لکھا جائے گا تو اس میں سے کئی خلا سامنے آئیں گے۔ پنجاب کا اُردو ادب ان خلاؤں کو پُر کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

سوال: پاکستان میں جامعاتی سطح پر جو تحقیقی کام ہو رہے ہیں کیا آپ ان سے مطمئن ہیں؟ ان کو کس طرح سودمند بنایا جاسکتا ہے؟ ایک یونیورسٹی میں اعلیٰ پائے کا تحقیق کام کن خصوصیات کی بنا پر انجام پاسکتا ہے؟

جواب: ۱۹۵۸ء کے بعد پاکستان میں حکومتی اور قومی سطح پر تحقیقی عمل کو فروغ دینے کے لیے مختلف ادارے قائم کیے گئے۔ حکومت کے قائم کردہ اداروں میں انجمن ترقی اُردو، مجلس ترقی ادب، اقبال اکیڈمی، بزمِ اقبال، ادارہ ثقافت اسلامیہ، پاکستان ہسٹاریکل ریسرچ سوسائٹی اور مقتدرہ قومی زبان قابلِ ذکر ہیں۔ قومی سطح پر دوست ملک ایران کے تعاون سے مرکز تحقیقات فارسی قائم کیا گیا، جو پاکستان اور ایران کا مشترک سرمایہ ہے۔ اسی نصب العین سے پاکستان کی تمام جامعات میں تحقیق کے شعبے قائم کیے گئے اور تحقیقی عمل کو جامعات کا لازمی جزو قرار دیا گیا۔ پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں میں سندی تحقیق پر توجہ دی گئی۔ ایم. اے کی سطح پر بنیادی کام، ایم فل کے لیے ترقی یافتہ عمل اور پی ایچ. ڈی کے لیے اعلیٰ تحقیقی کاموں کو اہمیت دی گئی۔ جامعات میں ادبی تحقیق کے حوالے سے اگر گفتگو کی جائے تو اس میں چند خوبیاں اور چند خامیاں نظر آتی ہیں۔ خوبیوں میں

اُردو زبان کے کلاسیکی ادب کی دریافت، بازیافت، تدوین اور قدر و قیمت کا تعین شامل ہے۔ نئے مصادرِ تحقیق اور امکانات کی تلاش بھی جامعات اور تحقیقی اداروں کے فرائض میں شامل کی گئی ہے۔ خامیوں کی ایک طویل فہرست موجود ہے جن میں پہلی بار اُردو ادب کی پاکستان کے حوالے سے شناخت جس سطح پر ہونی چاہیے، نہیں ہے۔ اُردو ادب کو پاکستان کی حدود سے باہر یعنی اُس حصے سے مختص کر دیا گیا جو پاکستان میں نہیں مثلاً بھارت کے تمام حصوں اور ہر شہر سے وابستہ ادب کو پاکستان میں تحقیق کے لیے ترجیح دی گئی ہے جو پاکستان کی جامعات کے لیے اہم ضرور ہے لازم و ملزوم نہیں۔ پاکستان کے کسی صوبے کے کلاسیکی ادب کو بطور خاص زیرِ مطالعہ لانے کی کوئی تحریک ادبی تحقیق کا لازمی جزو نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی پاکستان میں اُردو ادب کی تاریخ دکن، دہلی، لکھنؤ اور رام پور پٹنہ وغیرہ میں وجود میں آنے والے ادب پر انحصار کرتی ہے اور تاریخِ ادب اسی میسر یا روٹ پر مدوّن کی جاتی ہے جو دکن سے دہلی، دہلی سے لکھنؤ، لکھنؤ سے پنجاب اور پھر پنجاب سے واپس پلٹ جاتا ہے۔ یہ روٹ تحقیق میں علمی حق شناسی کا ثبوت مہیا نہیں کرتا۔ پاکستان میں اُردو زبان کی تاریخ اُس وقت تک سچائی اور دیانت داری سے نہیں لکھی جائے گی جب تک اُردو زبان کا آغاز غزنی سے کر کے اس کے فطری راستے سے پورے پاکستان میں ہوتا ہوا دکن، دہلی اور لکھنؤ میں داخل نہیں ہوگا۔ یہی اُردو زبان کا روٹ ہے اور یہی اُردو ادب کا۔ اُردو ادب کی تاریخ پنجاب کے اور دکن کے باہمی تعلقات، تاریخی و تہذیبی تسلسل سے عبارت ہے۔ باقی تمام مراکز ان دونوں کے فیض یافتہ ہیں۔ دکن میں اُردو زبان کی موجودگی کو پنجاب کے نقطۂ آغاز سے مشروط نہ کرنا اُردو کے حقائق کے منافی ہے۔ جب تک ادب کا درست راستہ یا میسر دریافت نہیں ہوتا، اُردو ادب کی کوئی تاریخ نہیں لکھی جاسکتی۔ میری دانست میں ادب کی اب تک لکھی جانے والی تاریخیں تکرار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ ان تاریخوں میں، خواہ وہ محمد حسین آزاد کی ہو، رام بابو سکسینہ کی ہو، گیان چند کی ہو، ڈاکٹر جمیل جالبی کی ہو یا ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی، فنی اعتبار سے بھی ان تاریخوں کو یا تو رجحانات کی تاریخ کہا جائے گا یا اسالیب کی۔ ادب کی تاریخ کہنا فی الحال بہت مشکل ہے (البتہ یہ بات تسلیم اور اعتراف کرنے کی ہے کہ اب تک لکھی گئی تاریخوں میں سب سے اہم عظیم اور محترم کام ڈاکٹر جمیل جالبی کا ہے۔ یہ لسانی رجحانات اور تحولاتِ تاریخ سہی لیکن جس طرح ادب کی معیار بندی اس تاریخ میں کی گئی ہے، کم مصنفین کے حصے میں یہ معیار اور

خصوصیت آئی ہے۔ تاریخ ادب اُردو تحقیق اور تنقید کا ایسا توازن مہیا کرتی ہے جو اس سے پہلے کسی تاریخ میں موجود نہیں۔ بلاشبہ اس کام کو ایک معیاری، مثالی اور دیرپا کام کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ بھی انھیں فضائل اور خصوصیات کی حامل ہے)۔ یہی تاریخیں ہماری جامعات میں پڑھائی جاتی ہیں، انھیں تاریخوں پر ہماری آئندہ نسلوں کے علم کو استوار کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں تحقیق کے بنیادی تصور کو اہمیت دی جائے۔ کلاسیکی اور جدید ادب دونوں پر تحقیق لازمی ہے۔ پورے ادب میں جو چیزیں تاریخ میں جگہ نہیں پاسکیں اور غیر متعارف رہ گئی ہیں انھیں جامعات کی سطح پر سامنے لایا جائے۔ غیر متعارف متون میں درجہ اوّل کے متون اور موضوعات پر پی ایچ.ڈی کے لیے مقالات لکھوائے جائیں۔ ان کے بعد درجہ دوم کے ادب کو ایم فل کے لیے اور درجہ سوم کے ادب کو ایم.اے کے لیے موضوعِ تحقیق قرار دیا جائے۔ ہماری جامعات میں اساتذہ کے ذہنی، علمی اور فکری معیار کی کمی نہیں۔ خوش قسمتی سے بین الاقوامی سطح کی تحقیق کی اہلیت پاکستانی اساتذہ میں موجود ہے۔ انھیں بے کار کی اٹھک بیٹھک میں نہ الجھایا جائے۔ حکومت بے وجہ اور بے جواز وسائل کی کثرت سے محققین اور اساتذہ کو سست رو اور تساہل پسند نہ بنائے۔ تحقیق کو زر اندوزی کے ساتھ منسلک نہ کیا جائے۔ معیاری تحقیق کے ذریعے فارغ التحصیل سکالروں کی ایسی کھیپ تیار کی جائے جو پاکستان میں تحقیق کی نیک نامی، معیار اور مثال کی ذمہ دار ہو۔ جامعات کو موضوع دیتے ہوئے یورپ کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے، پہلے اپنے وسائل اور اپنی ضروریات پر نظر رکھنی چاہیے۔ اس وقت جامعات میں اور پاکستان کے علمی اداروں میں جو تحقیق ہو رہی ہے وہ کسی اعتبار سے بھی تسلی بخش نہیں۔ اسے ایک اچھا اور قابلِ ذکر کام نہیں کہا جا سکتا البتہ اسے ایک عمدہ کام کہا جا سکتا ہے، لیکن اس کام سے تاریخِ ادب کی صادقانہ تدوین ممکن نہیں۔ یہی حال پاکستان سے باہر کی جامعات کا ہے، لیکن وہ اس لیے قابلِ معافی ہیں کہ وہ اُردو کو بحیثیت قومی زبان قبول کرنے کی پابند نہیں۔ ہم پر دنیا کی دوسری جامعات کی نسبت زیادہ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ جامعات کے اربابِ اختیار من مانی کرنے اور اُردو تحقیق کو انگریزی یا دوسری زبانوں کی روشِ تحقیق کا پابند بنانے کی بجائے اُردو کے تشخص اور شناخت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اسے پاکستانی اور قومی سوچ کے حوالے سے دیکھیں۔ اس سے تحقیقی عمل میں وقار اور سنجیدگی پیدا ہوگی۔

سوال: آپ کے نزدیک نوواردان بساطِ تحقیق کے لیے کیا امکانات موجود ہیں؟ اور آپ کی نظر میں عصر حاضر کے کاروان میں کون سے نام زیادہ سنجیدگی سے تحقیق کے شعبے میں پیش قدمی کر رہے ہیں؟

جواب: امکانات کا ذکر تو میں پہلے سوال میں کر چکا ہوں۔ نوجوان واردانِ تحقیق سے پاکستان کے علمی منظرنامے کی بے شمار توقعات وابستہ ہیں۔ نوواردانِ تحقیق کو کام کرنے کے لیے جو وسائل اور امکانات مہیا ہیں وہ ماضی کے محقق کو نصیب نہ تھے۔ الیکٹرانک میڈیا نے وسائلِ تحقیق کو محقق کے گھر آنگن میں تبدیل کر دیا ہے۔ کمپیوٹر کی ویب سائٹ پر آپ پوری دنیا میں کسی بھی موضوع پر انجام شدہ کام کو حاصل کر سکتے ہیں۔ پہلے دور کا محقق کنواں کھود کر پانی پیتا تھا، انیسویں صدی کے محقق کو اپنے کام کی نقل حاصل کرنے میں جو دشواری حاصل تھی وہی بیسویں صدی کے نصف تک نظر آتی ہے۔ لیکن قیام پاکستان سے اب تک تحقیقی وسائل میں جو انقلاب کی صورتیں نظر آتی ہیں اُن سے نوجوان محقق کو بہرہ مند ہونا چاہیے۔ اس وقت جامعات کے اساتذہ اور محققین دونوں تساہل کا شکار ہیں۔ ان کو اور موزوں عنوان اس وقت ملیں گے جب اُن کے اندر تحقیقی کام کی لگن اور اس دشوار گزار وادی میں اترنے کی ہمت پیدا ہوگی۔ قیامِ پاکستان کے بعد بزرگ محققین کے کارنامے نوجوان نسل کے لیے رہنما کی حیثیت سے موجود ہیں۔ حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر سیّد عبداللہ اور ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے بعد کی نسل کو جو احساسِ ذمہ داری دیا اور سنجیدہ راہیں بجھائیں، وہ نسل در نسل مستقبل کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ بزرگوں کے دور میں تحقیق کی رفتار اس لیے سست تھی کہ وہ مقالات پر سمجھوتا نہیں کرتے تھے۔ موجودہ دور میں ہر یونیورسٹی میں پی ایچ. ڈی اور ایم فل کی سطح پر کام کرنے والوں کی جو تعداد ہے وہ پچھلے دور میں شاید دس سال میں بھی اتنی نہیں ہوتی تھی۔ بزرگوں کی نسل سے اس وقت سب سے عالم، ذمہ دار اور صحیح معنوں میں تحقیقی عمل کے محافظ ڈاکٹر وحید قریشی ہیں لیکن خرابیِ صحت نے انھیں محدود کر رکھا ہے۔ آج بھی ان سے نوجوان محقق استفادہ کر رہا ہے۔ لیکن اس دور کا سب سے فعال بزرگ محقق ڈاکٹر جمیل جالبی کو قرار دیا جائے گا، جنھوں نے اسی سال کی عمر میں اپنی تاریخ ادب کا ایک اہم حصہ مکمل کیا ہے، یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ اس وقت نوجوان محققین میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جنھوں نے پنجاب یونیورسٹی یا اورینٹل کالج کی تحقیقی روایت سے براہِ راست یا بالواسطہ استفادہ کیا ہے۔ نوجوان محققین میں جو

اہم نام ہمارے سامنے آئے ہیں اِن میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر اکرام چغتائی، ڈاکٹر صابر کلوروی، ڈاکٹر معین الدین عقیل، ڈاکٹر صدیق جاوید، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر عطش درّانی، ڈاکٹر طارق ہاشمی، ڈاکٹر عطاالرحمٰن میو، ڈاکٹر سلیم ملک وغیرہ ذاتی کاوشوں اور جامعاتی تحقیق کی نگرانی میں برسرِ عمل ہیں۔ اِن میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی حیثیت سب سے نمایاں ہے۔ وہ اس پورے کے پورے قافلے کے میرِ کارواں اس لیے ہیں کہ اُن کی کتاب اُردو ادب کی تاریخ سب حلقوں سے داد وصول کر چکی ہے۔ جامعہ کراچی، جامعہ پنجاب، جامعہ پشاور، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی عہد آفریں تحقیقی کاموں میں منہمک ہیں۔ یہ کام مستقبل میں اپنی روشنی پھیلائیں گے اور محققین اس کے فیضانِ علم سے استفادہ کریں گے۔ تازہ واردان بساطِ تحقیق کے لیے یہ راستہ دشوار گزار ضرور ہے لیکن اسی راستے پر اُردو زبان وادب کے فروغ کا انحصار ہے اور یہی راستہ مستقبل کے محققین کے لیے نیک نامی اور بقائے دوام کا باعث ہوگا۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! آج کل آپ نمل یونیورسٹی سے وابستہ ہیں، نمل یونیورسٹی میں تحقیقی ماحول اور کام کے بارے میں کچھ فرمائیں گے؟

جواب: پاکستانی یونی ورسیٹوں میں نمل سب سے کم عمر یونیورسٹی ہے۔ ۱۹۹۴ء میں اس یونیورسٹی میں ایم.اے اُردو کی کلاسیں شروع کی گئیں۔ ۲۰۰۰ء میں ایم.اے کے جو مقالات لکھے گئے ان پر یونیورسٹی کے بجائے نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز کا نام ہے۔ ۲۰۰۰ء کے بعد جب اس دانش گاہ کو یونیورسٹی کا درجہ ملا تو اس میں ایم.اے کے تحقیقی مقالات لکھوانے کا آغاز ہوا۔ یہ تعداد سال بہ سال زیادہ ہوتی گئی۔ اب تک ایم.اے اُردو کے لیے تحقیقی مقالات کی تعداد ۲۰۰ کے قریب پہنچ چکی ہے اور ایم.اے اُردو کے لیے تحقیقی مقالہ لازمی قرار دیا گیا ہے۔ ایم.فل اور پی ایچ. ڈی کی کلاسیں اس سے چند برس بعد شروع ہوئیں اور یونیورسٹی میں سنجیدہ اور معیاری تحقیق کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی۔ ایم.اے کی سطح سے تحقیق وتدوین پر الگ مضمون کی تدریس شروع ہو جاتی ہے۔ یعنی تحقیق وتدوین پر ایک الگ پرچہ موجود ہے جسے تجربہ کار اور تحقیق میں نام رکھنے والے اساتذہ پڑھاتے ہیں۔ ایم.اے کی سطح پر اس پرچے میں مقالہ نگاری کے اصول اور مبادیاتِ تحقیق

پڑھائے جاتے ہیں۔ ایم.فل اور پی ایچ.ڈی کے کورسز اس سے ترقی یافتہ اور ایڈوانس ہیں۔ ایم.فل کی سند کے لیے اب تک دس مقالات لکھے جا چکے ہیں اور پی ایچ.ڈی کے لیے پچیس مقالات مکمل ہو چکے ہیں اور بارہ مقالات زیرِ تکمیل ہیں۔ تحقیقی مقالہ کی پیش کش کا طریقِ کار متعین ہے اور اصول وضوابط کی پابندی کے ساتھ مقالہ لکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ فنی اعتبار سے بھی مقالے کی ساخت پر توجہ دی جاتی ہے، پیش کش کا طریقہ بتایا جاتا ہے، حوالہ اور مآخذ بیان کرنے کے طریقوں میں بین الاقوامی اصولوں کی پابندی کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی کے بے لوث اور علم دوست ڈائریکٹر، بریگیڈیر ڈاکٹر عزیز احمد خان، شعبہ اُردو کے اَنتھک سربراہ ڈاکٹر رشید امجد اور دیگر اساتذہ لائقِ سپاس اور تحسین ہیں۔ شعبہ اُردو کے تحقیقی کام کا جائزہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک شعبہ اُردو کے دو تحقیقی مجلّوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ اُن میں سے ایک دریافت اور دوسرا تخلیقی ادب ہے۔ یہ دونوں مجلّے تحقیقی نگارشات کے لیے مستحسن ہیں۔ معیار اور مواد کے اعتبار سے انھیں اہلِ علم کے حلقوں میں غیر معمولی داد و تحسین سے نوازا گیا ہے۔ ان مجلّوں کے روحِ رواں بھی ڈائریکٹر یونیورسٹی اور صدرِ شعبہ اُردو ہیں۔ یہ دونوں مجلّے ہائر ایجوکیشن کمیشن کے منظور شدہ ہیں اور اس وقت بلاشبہ پاکستان کے اہم ترین تحقیقی مجلوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز کا شعبۂ اُردو تحقیقی نصاب پر وقتاً فوقتاً نظرِ ثانی کرتا رہتا ہے اور اسے نہ صرف پاکستان کی دوسری یونیورسٹیوں سے ہم آہنگ کیا جاتا ہے اور اس کے تحقیقی عمل کے تکرار کو داخل نہیں ہونے دیا جاتا بلکہ عالمی سطح پر رونما ہونے والے تحقیقی عمل میں یونیورسٹی کی کاوشوں کو شامل کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔

سوال: مستقبل میں آپ کے تحقیقی منصوبے کیا ہیں؟

جواب: میرے پاس کوئی سو سے زیادہ ایسے منصوبے جاری ہیں جن پر میں کام کر رہا ہوں۔ ان منصوبوں میں نایاب اور گمنام اُردو متون کی بازیافت بالخصوص پنجاب میں اُردو ادب کے حوالے سے ایسے کاموں کو منظرِ عام پر لانا جن پر ابھی تک محققین کی نظر نہیں پہنچ سکی اور جنھیں تاریخِ ادب کا حصہ بنایا جاسکتا ہے، وہ میرے مستقبل کے منصوبوں میں شامل ہیں۔ پہلے میری ہر سال تین کتابیں ضرور شائع ہوتی تھیں، ان دنوں تھوڑا سا حالات کے اتار چڑھاؤ کے باعث تعطل ہے۔

لیکن بعض تحقیقی منصوبے زیرِ اشاعت ہیں، ان میں مطالعۂ غالب کا دوسرا ایڈیشن شامل ہے جس میں متعدد اضافے کیے گئے ہیں۔ میرے تحقیقی مقالات کا نیا مجموعہ تحقیقی تناظر اور میری کتاب یادگارِ غالب کا نیا ایڈیشن شامل ہے۔ اس کے علاوہ پنجاب کے ایک صوفی بزرگ حضرت شاہ دولہ کی معاصر سوانح عمری بھی مرتب ہو کر زیرِ اشاعت ہے۔

اشاریہ

اشخاص

کتب، رسائل، اخبارات

دائیں سے بائیں: فرید گوہر، انور مسعود، ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ڈاکٹر سحر انصاری

دائیں سے بائیں: افتخار عارف، ڈاکٹر جعفر شہیدی، ڈاکٹر گوہر نوشاہی، معتمد لغت نامہ
(دفتر لغت نامہ دہخدا، تہران)
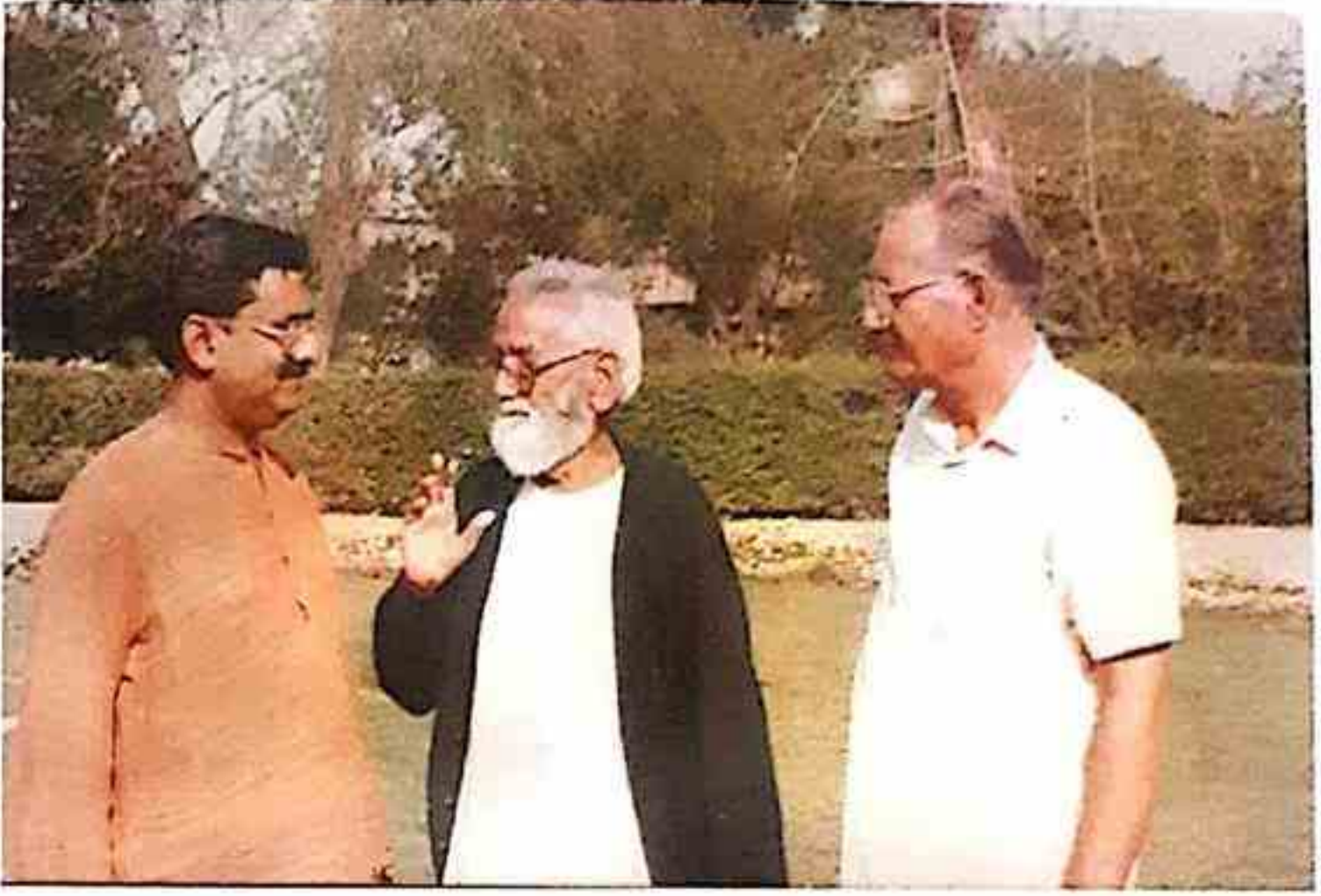
دائیں سے بائیں: مشفق خواجہ، جلیل قدوائی، ڈاکٹر گوہر نوشاہی

دائیں سے بائیں: ڈاکٹر وحید قریشی، پروفیسر شریف کنجاہی، ڈاکٹر گوہر نوشاہی

دائیں سے بائیں: ڈاکٹر گوہر نوشاہی، سیّد امتیاز علی تاج، جسٹس عطاء اللہ سجاد، ڈاکٹر سیّد عبداللہ،
ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، صفدر ادیب

تہران یونیورسٹی (ایران) کے چانسلر، ڈاکٹر گوہر نوشاہی کو تحفہ پیش کر رہے ہیں۔
اُن کے ساتھ ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر نور محمد مہر نمایاں ہیں۔

مجمع استادان، تہران سے خطاب کرتے ہوئے

اُردو کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے

محمد افضل صفی

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا شمار عہدِ موجود کے ممتاز محققین، مدوّنین اور دانش وروں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے علمی اور تحقیقی کارنامے مختلف موضوعات اور ایک سے زیادہ زبانوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بالخصوص اُردو، فارسی اور پنجابی زبانوں میں اُن کا کام قابلِ قدر ہے۔ اِس کتاب میں ڈاکٹر صاحب کی فارسی خدمات کی تفصیل بھی فراہم کی گئی ہے اور اُن کے مندرجات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ گوہر شناسی میں اس کتاب کی حیثیت سنگِ میل کی سی ہے۔ مصنف نے نہایت محنت اور عرق ریزی سے ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی زندگی اور اُن کے تحقیقی و تدوینی کارناموں کا جائزہ پیش کیا ہے۔ نتائج کے استخراج اور کتابوں کے تجزیے میں انھوں نے تحقیقی اور تنقیدی اُصولوں اور قاعدوں کی مکمل پاسداری کی ہے۔

محمد افضل صفی استادِ اُردو زبان و ادب کی حیثیت سے اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے ''صحرا سے گفتگو'' اور ''نگاہیں اُداس ہیں'' شائع ہو کر، قارئین سے دادِ تحسین قبول کر چکے ہیں۔

vprint.vp@gmail.com
051-5514796

Al-Fath Publications
Rawalpindi, Pakistan

US $ 23.
Rs. 250.

alfathpublications@gmail.com + 92 322 517 741 3

www.vprint.com.pk

9789699400117